برصغیر میں قدیم کتابیں کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔

کتب خانہ



کُتب خانہ

پاکستان اور ہندوستان میں
ہماری قدیم کتابیں کہاں
کہاں اور کس حال میں ہیں

بی بی سی لندن کی اُردو سروس کے
سلسلے وار پروگرام "کُتب خانہ" پر مبنی نشریئے

رضا علی عابدی

سعد پبلی کیشنز۔ کراچی

کتب خانہ کے ناشر :- سعد پبلیکیشنز ہادی مارکیٹ ناظم آباد کراچی نمبر ۴

مرکزی دفتر :- ۲۱ اے محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۸

سرورق کی تخلیقی کاوش :- شاہد راجپوت

خطاطی :- عبدالشکور خرم

پہلے ایڈیشن کی تاریخ اشاعت :- اپریل ۱۹۸۵ء

نسخوں کی تعداد :- ایک ہزار

قیمت :- مجلّد ۹۰ روپے
غیر مجلّد ۶۰ روپے

فیض احمد فیضؔ کے نام

جن کے سخن نے کتابِ عمرِ گزشتہ کے
حرفِ سادہ کو اعجاز کا رنگ عنایت کیا

عنوان

پیش لفظ

جب بی بی سی کی اُردو سروس کے ڈیوڈ پیج نے مجھ سے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کو کہا تو میں آمادہ نہ تھا۔ میں نے کہا "اُردو میں میرے کام کی نوعیت ایسی نہیں رہی کہ کتب خانوں کی چھان بین کی ضرورت پڑتی، اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کام کے لئے موزوں آدمی ہوں۔" اس پر ڈیوڈ کہنے لگے "آپ فوراً انکار نہ کیجئے۔ مجھ سے اور رضا علی سے آکے ملئے تاکہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہو۔"

میں گیا اور جب گفتگو تفصیل سے ہوئی تو میری دلچسپی کا سامان نکلا۔ میں مسودہ اپنے ہمراہ گھر لے گیا اور پہلی ہی فرصت میں پڑھنا شروع کیا۔

میں جیسے جیسے پڑھتا گیا، میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ اسی دوران میں نے ڈیوڈ اور رضا علی کو فون کر کے بتایا کہ میں پیش لفظ یقیناً لکھوں گا۔

کتاب کے بہت سے حصّوں کو میں نے توجہ سے پڑھا۔ مثلاً وہ باب جس میں کلیاتِ غواصی کی دریافت کا بیان ہے اور وہ حصّہ جس میں رضا علی نے نسخۂ بیاضِ غالب

بخط غالب ،، کا سارا قصّہ لکھا ہے ، کسی جاسوسی ناول سے کم دلچسپ نہیں ۔ جو باب پڑھئے آپ کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے ۔ (یہ ضمنی بات ہے لیکن لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رضا علی عابدی کی زبان اور طرزِ بیان دونوں اتنے اچھے ہیں کہ پڑھ کے طبیعت خوش ہو گئی ۔ نہ انگریزی الفاظ کا بلاضرورت استعمال اور نہ ثقیل اردو الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش ۔ سلیس اور رواں اُردو میں اپنی بات کہے جاتے ہیں اور پڑھنے والے کو بڑا لطف آتا ہے ۔)

ایک طرح سے یہ کتاب ایک پُر زور اپیل کی تمہید ہے اس کتاب نے افراد، انجمنوں اور ارباب حل و عقد ، سب کی توجہ اس طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پبلک اور ذاتی کتب خانوں اور مدرسوں ، خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہا کتابوں اور مخطوطوں کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول مصنف ،، اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آجائے ،، اور اگر اس کا تحفظ نہ کیا گیا اور بہت جلد نہ کیا گیا تو اس کا بہت بڑا حصّہ تباہ ہو جائے گا ۔

مجھے یقین ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں اس ورثے کی قدر ہے ۔ بی بی سی اور اس کتاب کے ناشر سعد پبلیکیشنز کا شکر گزار ہو گا اور اس اپیل کی پوری پوری حمایت کرے گا ۔

لندن

۴ ، فروری ۱۹۸۵ء

رالف رسل

اِن سے ملئے

یہ وہ کتابیں ہیں جو آج ہیں اور شاید کل نہ ہوں۔ اور یہ اُن بے شمار کتابوں کے مزار ہیں جو خاک کی صحبت میں رہتے رہتے خود بھی خاک ہوگئیں۔ ایسی خاک جس سے اب کوئی شگوفہ نہیں پھُوٹے گا۔

یہ اُس قافلے کا ذکر ہے جس کے قدموں کے زیادہ تر نشان مٹ چکے ہیں لیکن جو باقی ہیں وہ اتنے کم بھی نہیں کہ سمتوں اور منزلوں کا پتہ نہ چلے۔ گفتگو ہماری یہی ہے کہ اب جیسے بھی بنے، ان نشانوں کو نئے شعور کے دامن سے یوں ڈھانپ لیا جائے کہ اب نہ کوئی جھونکا ادھر سے گزرے اور نہ پگڈنڈیوں پر نئی گھاس اُگے۔

یہ قدیم کتابوں اور دستاویزوں کو مٹنے سے بچانے کی امنگ کا ذکر ہے۔

پرانی کتابوں کی بات ۱۹۰۵ء کے شروع میں یوُں چھڑی تھی کہ بی بی سی، لندن کی اردو سروس نے اس وقت ''کتب خانہ'' کے عنوان سے پہلا سلسلے وار پروگرام نشر کیا تھا۔ وہ برطانیہ میں محفوظ پرانی اردو کتابوں کا تعارف تھا۔ ایک عام تاثر یہ تھا کہ یہ کتابوں سے بیزاری کا دور ہے اور یہ

کہ کتابوں کی باتیں بس گنے چنے لوگ سُنیں گے۔ مگر وہ قیاس صحیح نہ تھا۔ برصغیر کے ہر گوشے اور قریے میں کتابوں کی باتیں دلچسپی سے سُنی گئیں۔ پروگرام کی حمایت میں آنے والے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور یوں لگا کہ قدیم کتابوں کے بارے میں جو ہم نے کہا، گویا ہر ایک کے دل میں پہلے سے تھا۔ وہ پروگرام ۱۴ ہفتوں کے لئے شروع کیا گیا تھا لیکن ۴۰ ہفتے چلا اور اُس کا بند ہونا بے شمار سُننے والوں کی خفگی کا باعث بنا۔

لیکن شکایتوں کے خطوں میں کچھ حکایتیں بھی چھُپی ہوئی تھیں۔ کتنے ہی سامعین کو اندازہ نہ تھا کہ خود برِصغیر میں کیسے کیسے عظیم الشان کتب خانے موجود ہیں جن کی الماریوں میں سلیقے سے چُنی ہوئی نایاب کتابیں کب سے اپنے قاری کی منتظر ہیں۔ اس پر بی بی سی کو خیال آیا کہ کیوں نہ اسی عنوان سے ایک نیا پروگرام ترتیب دیا جائے۔ موقع پر جاکر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی پہاڑیوں سے لے کر مدراس کے ساحلوں تک اور بنگال کے سبزہ زاروں سے راجستھان کے ریگ زاروں تک قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں۔

اس تحقیق کا شرف مجھے ملا۔ موضوع پسندیدہ ہو تو صعوبتوں کا احساس مِٹ جاتا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ میں نے بہت کونے جھانکے۔ کسی میں نور بھرا تھا اور کہیں اندھیروں کا راج تھا۔ کہیں کتابیں بچائی جارہی تھیں اور کہیں کیڑوں کی غذا بن رہی تھیں۔ اُن سب کا احوال جمع کیا تو کتب خانہ ہی کے عنوان سے پروگرام کا دوسرا سلسلہ تشکیل ہوا۔ یہ ۱۹۸۲ء کے اوائل کی بات ہے۔ اس تحقیق کو ریڈیائی گفتگو بننے میں آدھا برس لگا۔ اور یہ پروگرام اسی سال اکتوبر سے شروع ہوئے اور چھ ماہ چلے۔ بات اب کے ذرا مختلف تھی اور دل کو ایک دھڑکا سا تھا لیکن یہ پروگرام بھی بہت مقبول ہوا اور اتنا سراہا گیا اور اتنی توجہ سے سنا گیا کہ اس پر سامعین کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

اسی غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اس ساری تحقیق کو کتاب کی شکل میں محفوظ کرنے کا خیال آیا میں نے سوچا کہ ہواؤں میں بکھر جانے والی بات اس طرح محفوظ رہ جائیگی، اطمینان سے پڑھی جائیگی اور اُن لوگوں تک بھی پہنچ جائے گی جو کسی وجہ سے ریڈیو پروگرام نہیں سُن سکے۔ کراچی کی ایک نشست میں اسمٰعیل صاحب سعد

سے اس کا ذکر ہوا تو بڑے بڑے فیصلے ایک لمحے میں ہو جانے کی ایک نئی مثال قائم ہوئی۔ انہوں نے فوراً ہی یہ کتاب شائع کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور کام چل نکلا۔ بی بی سی اُنکی شکرگزار ہے۔ انہوں نے بلاشبہ اپنے علم دوست گھرانے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

یہ کتاب دوسری کتابوں سے ذرا مختلف ہے۔

یہ دراصل ریڈیو کا دستاویزی پروگرام ہے جسے کتاب کی شکل دی گئی ہے۔ اس کی ساری تحریر میں تقریر کا انداز ہے۔ اس پُوری گفتگو میں قدم قدم پر مختلف اہلِ علم بھی محوِ گفتگو ملیں گے۔ یہ وہ محترم شخصیتیں ہیں جن کی آنکھیں کتابوں کے قرب سے منوّر اور جن کے دل کتابوں کے درد سے معمور ہیں۔ اُن کا انداز بھی تقریر کا ہے۔ گفتگو کے وقت اُن کے سامنے کوئی تحریر نہ تھی لہٰذا کہیں جملے ذرا سے بے ربط ہیں تو کہیں لفظوں کی تکرار ہے۔ اکثر جگہ علاقائی لب و لہجہ بھی برقرار ہے۔ بات کا یہ فطری انداز کتاب میں جوں کا توں رکھا گیا ہے تاکہ اُس پر پیوند کا گماں نہ ہو۔

بی بی سی کی نشرگاہ اس معاملے میں خوش نصیب ہے کہ جیسے جیسے یہ پروگرام نشر ہوتا گیا معزز سامعین کے تبصرے اور مشورے موصول ہوتے گئے۔ کہیں انہوں نے ہماری اصلاح کی اور کہیں رہنمائی کی۔ اُن کی یہ نشان دہی بڑی کارگر ہوئی جس کے مطابق کتاب کے مسودے میں ردّ و بدل کر لی گئی اور گراں قدر اضافے بھی ہوئے۔ وہ سامعین شکریہ کے مستحق ہیں۔

چند باتیں اور بہت اہم ہیں۔

یہ کتاب برِصغیر کے کتب خانوں کی جامع فہرست نہیں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں کتب خانے اتنے بہت سے ہیں اور دور دراز علاقوں میں ہیں کہ ان کی فہرست ترتیب دینا یُوں بھی کچھ آسان کام نہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس میں کئی ایسے کتب خانوں کا ذکر شامل نہ ہو جن کا ہونا بہت ضروری تھا۔ میں اُن سے معذرت خواہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کی بیشتر گفتگو اُردو، فارسی اور عربی کتابوں اور دستاویزوں کے حوالے سے ہے۔ برِصغیر کی دوسری زبانوں کی کتابوں اور ان کے مخصوص کتب خانوں کا ذکر بہت

کم ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے مسئلے اور ان کے تقاضے مختلف یا کم تر ہیں۔ ان کو بھی توجہ اور دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہے۔

تیسری بات یہ کہ اپنی تحقیق کے دوران ہر جگہ خود جانا اور موقع پر مشاہدہ اور تصدیق کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ ایسی صورت میں کوئی نہ کوئی راوی میرا حوالہ بنا ہے۔ اگرچہ ہر راوی مستند، معتبر اور باخبر ہے۔ لیکن کہیں روایت میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہو تو سہو سمجھئے اور درگزر کر دیجئے۔

ایک اور بات یہ کہ ساری تحقیق ۱۹۸۲ء کے ابتدائی چار مہینوں میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بعض منصوبے مکمل ہو گئے ہیں۔ کچھ کتب خانوں میں توسیع ہوئی ہے۔ کسی سے شکایتیں تھیں ان کی چھان بین ہوئی ہے۔ چند کتب خانوں کی حالت بگڑی ہے اور دو ایک کتب خانے اس وقت تھے اب نہیں ہیں۔ تعمیر و تخریب کا یہ عمل تیز ہے۔ ترمیم و تنسیخ اس سے قدم ملا کے نہیں چل پائے گی، یہ سوچ کر میں نے اپنے اصل بیان کو جوں کا توں چھوڑ دیا ہے۔ اس سوچ میں یہ اُمید چھپی ہے کہ پھر کوئی تازہ دم محقق اٹھے گا اور میری اس تحقیق کو آگے بڑھائے گا جو ایک کوہ کن کی پہلی ضرب سے زیادہ نہیں۔

مگر اس وادی میں ایک تنہا آبلہ پا میں ہی نہ تھا، میرے بہت سے شریک سفر بھی تھے جو بڑے شکریئے کے مستحق ہیں۔ کتنے ہی اساتذہ، محقق، نقّاد، مصنّف، کتب خانوں، عجائب گھروں اور آرکائیوز کے ذمہ دار افراد، طالب علم، تاجر، عام سامعین اور جہاندیدہ بزرگ میری مدد کو آئے بیشتر نے انہوں نے اپنے گھروں، اداروں اور کتب خانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اپنا قیمتی وقت دیا اور اکثر بڑی زحمت اٹھائی۔ ان کی فہرست طویل ہے لیکن کتاب کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر اُن کے نام آئیں گے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں۔

اُن میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو چند برس کے اس وقفے میں اس جہاں سے سدھاریں۔ وہ سب کتابوں کی محبت سے سرشار تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا ان کی اس عبادت کی جزا انہیں دے گا۔ وہ بھی اس پروگرام اور اس کتاب کے مرکزی خیال سے متفق تھے کہ قدیم کتابوں کے ورثے

کو بچانے اور محفوظ کرنے کی ضرورت کا شعور بیدار کیا جائے۔ پرانے مخطوطوں اور دستاویزوں کے تحفظ کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جائے اور یہ کام جس قدر جلد شروع ہو جائے اچھا ہے۔

اس موقع پر برطانیہ میں اردو کے نامور محقق اور اُستاد رالف رسل کا شکریہ کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ پڑھا اور پیش لفظ لکھا۔ بی بی سی کی اُردو سروس کے پروگرام آرگنائزر ڈیوڈ پیج کا شکریہ کہ انہوں نے اس پروگرام کا پہلا خیال ذہن میں سمانے سے لے کر اس کتاب کے چھاپے خانے سے باہر آنے تک غیر معمولی تعاون کیا اور سہارا دیا۔

اور سب سے بڑھ کر بی بی سی کے سامعین کا شکریہ جو پروگرام کے نشر یے اور کتاب کی اشاعت کے درمیانی وقفے میں ہمارے حوصلے بڑھاتے رہے اور ہمیں سنبھالے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے، کہ بی بی سی کی مطبوعات کی تاریخ میں یہ پہلی اُردو کتاب وجود میں آئی ہے، جو سامعین اور قارئین کی نذر ہے۔

رضا علی عابدی

۱۹۸۵ء

بی بی سی - اردو سروس
بش ہاؤس لندن۔ ڈبلیو سی ۲
۵ر فروری ۱۹۸۵ء

کتاب کس حال میں ہے

فروری کا دوسرا ہفتہ تھا۔ اسلام آباد کی پہاڑیوں پر صبح کی پیلی دھوپ پھیل رہی تھی اور دُور قراقرم کی چوٹیوں پر برف اب چمکنے لگی تھی۔ میں ہوائی اڈّے سے باہر نکلا اور فوراً ہی ٹیکسی لے لی تاکہ جلد سے جلد اپنے ہوٹل پہنچ جاؤں۔ اور وہاں پہنچ کر آئینے میں یہ بھی نہ دیکھا کہ سر کے بال دُرست ہیں یا نہیں، ٹائی کی گرہ سیدھی ہے کہ نہیں، میں لپکتا ہوا اسلام آباد سکریٹریٹ کی جلسہ گاہ میں جا پہنچا۔

وہاں حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام دستاویزوں کی حفاظت کے موضوع پر بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ جاری تھی۔ دو ڈھائی سو مندوب بڑی سنجیدگی سے بیٹھے اُتنے ہی سنجیدہ سوال پر غور کر رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کاغذ، وہ دستاویزیں، وہ کتابیں اور وہ نسخے کیونکر محفوظ کیے جائیں جن کی بنیادوں پر قوموں کی، ملکوں اور معاشروں کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ وہ خط، وہ عرضیاں وہ احکامات اور وہ فرمان جو وقت کے دھاروں کے رُخ موڑ دیا کرتے ہیں، انہیں حالات کی گرد سے، لمحات کے سیلاب سے اور قدامت کے بدن میں پلنے والے کیڑوں سے کس طرح بچایا جائے؟

کو محفوظ رکھنے کے ماہر تھے۔ برٹش لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری کے مہتمم آئے تھے جو دنیا زمانے کی کتابوں، نقشوں، فائلوں اور رجسٹروں کو کچھ اس طرح سینت سینت کر رکھتے ہیں کہ جیسے آتے جاتے لمحوں کی روداد کو وقت کی دستبرد سے بچا بچا کر رکھنے کی ساری ذمّے داری اُن ہی پر آن پڑی ہو۔

حاضرینِ جلسہ مصروف تھے اور میں مسرور تھا۔ برِصغیر میں اب یہ احساس جاگ رہا ہے کہ تاریخ کے ورثے کو بچایا جائے۔ آنے والی نسلوں کے لیے وہ تمام نشانیاں چھوڑ دی جائیں جو بعد میں مشعل بن کر اُن کی راہوں میں نور پھیلائیں۔

مگر اس احساس کی تہ میں کتنے ہی درد اور کتنے ہی کرب چُھپے ہوئے ہیں۔ یہ گزری صدیوں کی نہیں، حالیہ برسوں کی بات ہے جب اعلیٰ روایات اور تہذیب کے اسی گہوارے میں اور اسی سرزمین میں نہ معلوم کتنی دستاویزیں مٹّی میں اور نجانے کتنے کتب خانے خاک میں ملے ہیں۔

یہاں ہم علم کے اُن سفینوں کی باتیں کریں گے جو بے خبری کے ساحلوں سے چلے اور قدرشناسی کے محفوظ کناروں پر جا لگے اور علم کے اُن قافلوں کا ذکر بھی ہوگا جو راہ میں دن دہاڑے لُٹ گئے۔

ہم بات کریں گے اس موضوع پر کہ کہاں کہاں کیسی کیسی کتابیں محفوظ ہیں اور وہ کس حال میں ہیں، اور کہاں کہاں علم و حکمت کے خزانے یوں گاڑے گئے کہ پھر کبھی انہیں دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ہم گفتگو کریں گے برِصغیر کے اہلِ علم حضرات سے، علم دوست حضرات سے، اُن سے جو ساری زندگی کتابوں کے درمیان گزارتے ہیں اور اُن سے جن کے دل اور دماغ کے درمیان اب کتابوں کا بسیرا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی دفن کیے جانے والے خزینوں کی۔

مشفق خواجہ ادب کے شیدائی ہیں۔ جس مکان میں رہتے ہیں اس کے کمروں اور برآمدوں کی دیواریں نظر نہیں آتیں کیونکہ اُن کے آگے کتابیں چُنی ہیں۔ بتا رہے تھے کہ کتابوں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں :

"بعض ذخیرے ایسے بھی ہیں جو بزرگوں کے مزاروں پر موجود ہیں۔ میرے سننے میں یہ آیا کہ جب کچھ عرصہ قبل حکومت نے مزاروں کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں دیا تو وہاں جو لوگ تھے انہوں نے مخطوطات کو زمین میں گاڑ دیا کہ حکومت اُن پر قبضہ نہ کرلے۔ اب زمین میں گاڑے ہوئے مخطوطات کا حشر کیا ہوگا ؟ میرا خیال ہے وہی ہونا چاہیئے جو آدمی کا ہوتا ہے۔"

کتابوں کے دشمن صرف کیڑے مکوڑے ہی نہیں، کچھ اور بھی ہیں۔ جو پرانے گھرانے باپ دادا کے ورثے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، ان پر خوف کا عالم طاری ہے کیونکہ انہیں ستانے والوں کی کمی نہیں۔ مثلاً انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی جام شورو کے نگراں ڈاکٹر غلام علی الآنا بتا رہے تھے کہ ٹھٹھہ جیسے تاریخی علاقے کے گھرانوں سے اگرچہ سینکڑوں نادر اور نایاب کتابیں اور خصوصاً قرآن، تفاسیر اور احادیث کے نسخے حاصل کر لیے گئے ہیں لیکن :

"اب لوگ یہ تاریخی کتابیں دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں، وہ ڈرتے ہیں کہ یہ ورثہ اُن سے کوئی چھین نہ لے۔ ماضی میں بارہا یہ ہوا کہ کوئی ایسا ضلعی حاکم آیا جسے تاریخی نوادر سے دلچسپی ہوگئی اور لوگوں کو مجبوراً یہ کتابیں دینا پڑیں۔ اس لیے اب وہ اپنی کتابیں دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

اور کتنے ہی گھرانے ایسے ہیں جہاں علم و حکمت کے موتی نسل در نسل چلے لیکن جوں ہی بزرگوں کی آنکھ بند ہوئی یہ موتی اِدھر اُدھر رُل گئے اور ایسی ایسی کتابیں، دستاویزیں، نقشے اور فرمان جو ہماری تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کا پتہ دیتے، آپ ہی گم ہو گئے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اُردو کے استاد ہیں اور ادب کے ہر تاریک اور روشن گوشے تک

ان کی رسائی ہے۔ انہوں نے کتنے ہی کتب خانے بنتے دیکھے اور ان ہی کی آنکھوں نے کتنے ہی ذخیرے ٹُوٹتے دیکھے۔ انہوں نے کہا :

"جو ذاتی ذخیرے ہیں اب لوگ دبائے بیٹھے ہیں کہ صاحب یہ تو کروڑوں روپے کا سرمایہ ہے اور بڑی نادر چیزیں ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ نادر ہیں لیکن جو آدمی اپنی تحویل میں لیے بیٹھا ہے جب اُس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے تو اس کی اولاد اور اس کے ورثا نہیں جانتے کہ ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے، چنانچہ ایسے بعض ذخیروں کا تالا ہی نہیں کھلتا۔ بکس ہی نہیں کھول کر دیکھے جاتے، یا لوگ چرا کر لے جاتے ہیں یا جو ورثا ان کی اہمیت کو نہیں جانتے وہ ان کو ردی کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں اور اس طرح بہت سے ایسے ذخیرے جو ملک کے دُور دراز علاقوں میں نجی تحویل میں ہیں وہ برباد ہو رہے ہیں اور ان کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ ہے۔"

جن لوگوں کو کتابوں سے عشق ہوتا ہے، جنگل اور دریا پھر ان کا راستہ نہیں روکتے۔ آندھرا پردیش کے نامور محقق ڈاکٹر ضیا الدین احمد شکیب علم کی جستجو میں متھرا سے لے کر سیتا مئو تک کہاں کہاں نہیں گئے۔ جہاں خبر ملی کہ قدیم دستاویزوں کا کوئی ذخیرہ موجود ہے، ڈاکٹر صاحب وہاں ایک بار نہیں، بار بار گئے۔ وہاں انہوں نے کیا دیکھا :

"میں نے بعض جگہ دیکھا کہ ایسی ایسی کتابیں ہیں جو بارہ سو اور تیرہ سو سال پرانی ہیں اور ایسی چھت کے نیچے ہیں جو ہر سال بارش میں ٹپکتی ہے۔ اور مالک یہ چاہتے ہیں کہ اُن سے جدا نہ ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لاکھوں کی چیز ہے لیکن ان میں اتنی بھی استعداد نہیں کہ کسی بینک میں رکھا دیں۔ ایسے بہت سے کتب خانے ہیں کہ جب ہم سال بھر کے بعد دوبارہ جاتے ہیں کہ ذرا دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یا تو دیمک چاٹ گئی یا چوہوں نے کتر لیا، یا پانی لگ گیا یا کچھ جل گئے یا بچوں نے لاپروائی سے کہیں پھینک دیا۔ ایسے حادثے دن رات ہو رہے ہیں۔"

اپنی اس گفتگو میں جب ہم مطبوعہ یعنی چھپی ہوئی اور مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کے ذخیروں کی بات کریں گے تو پرانی کتابوں کے تاجروں کا ذکر بھی آئے گا۔ ایسے تاجروں کا بھی جنھوں نے علم کا اور تاریخ کا بیوپار کیا، اور ایسے تاجروں کا بھی جنہیں کتابوں کی تجارت کرتے کرتے ان سے جذباتی لگاؤ ہوگیا اور جنھوں نے بیل گاڑیوں اور چھکڑوں میں بھری ہوئی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہوتے دیکھیں، مثلاً حیدرآباد دکن کے علیم الدین جنھوں نے کہا :

"امیر پائیگاہ ظہیر یار جنگ کی مثال لیجئے۔ اُن کا انتقال ہوا تو ان کی بیوہ نے ایک لاری بھر کر کتابوں کا ذخیرہ بیچ دیا اور وہ یہاں سے ایران چلی گئیں، اور یہ لاری بھر ذخیرہ کوڑیوں کے دام، صرف ڈھائی ہزار میں دے گئیں۔ کم سے کم دو لاکھ تین لاکھ کی چیزیں تھیں۔ مجھے اتنا دکھ ہوا، اتنا دکھ ہوا کہ کھانا نہیں کھایا گیا، بالفاظِ دیگر :"

کتاب کا معاملہ بھی خوب ہے۔ کتاب اپنے قاری سے بیک وقت دو عشق طلب کرتی ہے، ایک تو خود کتاب کا عشق اور دوسرے علم کا عشق۔ یہ بات ہم بھی کہتے ہیں اور یہی بات اُردو کے بزرگ شاعر اور خدمت گزار سکندر علی وجدؔ نے بھی کہی جنھوں نے برسہا برس بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی رفاقت میں کام کیا اور گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جاکر پرانی کتابیں جمع کیں۔ کہنے لگے :

"کتاب کے عشق کے بغیر کتاب محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اب اس میں شک نہیں کہ ہماری کتابیں ملک سے باہر چلی جارہی ہیں مگر مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ وہاں انہیں بڑی احتیاط اور اہتمام سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ فیومی گیشن ہوتا ہے، ائر کنڈیشنڈ کمروں میں رکھا جاتا ہے۔ اب ہمارے پاس کتابوں میں نیم کے پتے رکھ دیتے ہیں، اس سے اور کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ تو کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ عشق چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ علم کا بھی عشق چاہیئے مگر اب علم بھی نہیں ہے اور عشق بھی نہیں ہے۔ ہمارے گھروں میں ریڈیو ہے، ٹیلیویژن ہے، سب کچھ ہے لیکن کتاب نہیں ہے :"

اسلام آباد کی کانفرنس، پاکستان میں لائبریری آرڈی ننس نافذ کرنے کی تجویز، دلّی میں دستاویزوں کے تحفظ کی تعلیم و تربیت اور کلکتے میں ہر وہ کتاب جمع کرنے کی تگ و دو کہ جو کسی بھی چھاپے خانے سے نکلے، یہ سب ایک نئی اُمنگ کی پہلی پہلی علامتیں ہیں۔ حکومتیں، ادارے اور افراد اب بے عملی کی اندھیری کوٹھڑی سے آگہی اور دانش کے روشن دالان میں نکل آئے ہیں۔ مگر یہ محض آغاز ہے۔ ابھی بہت سا کام ہونا ہے، مریض کی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈے پھاہے رکھنے کی ضرورت ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اِس گفتگو کو ہم گوپی چند نارنگ کی اس بات پر ختم کرتے ہیں :

"بالعموم کتب خانوں کی جو حالت ہے، چند ایک کو چھوڑ کے، وہ زیادہ اچھی نہیں کیونکہ ان سے استفادہ کرنے والے اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ کہنے کو تو ہر شخص محقق ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہتا ہے مگر اس کے لیے جس لگن کی ضرورت ہے وہ لوگوں میں دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ اِس طرف آپ جتنی بھی توجہ دلائیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہ صرف ایک طرح کی خدمت ہوگی بلکہ انتباہ بھی ہوگا اور قومی ذخیرے، خواہ کسی ملک کے ہوں، کسی قوم کے ہوں، کسی معاشرے کے ہوں، کسی زبان کے ہوں وہ پوری بنی نوعِ انسان کی میراث ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے جتنی بھی کوشش آپ کر سکیں اور اس سلسلے میں جتنی بھی بیداری آپ پیدا کر سکیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی مستحسن اقدام ہوگا۔"

روشنیوں کے جزیرے

کہتے ہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب برصغیر کے ہر صاحبِ حیثیت کے دولت خانے میں تین خانے اور ہوا کرتے تھے۔ مہمان خانہ، اسلحہ خانہ اور کتب خانہ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف حیدر آباد دکن میں چار ہزار کتب خانے تھے مگر ہوا کے رُخ بدلے تو وقت کے جھونکے اُن دولت خانوں کو سوکھے پتّوں کی طرح اُڑا لے گئے۔

بوسیدہ مکانوں کے اندر اور ٹوٹی پھوٹی چھتوں کے نیچے ایسے کئی بزرگوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کتابوں کے یہ شاندار ذخیرے دیکھے تھے، اور پھر ان ہی کی آنکھوں نے سونے چاندی کے پانی سے لکھی ہوئی کتابیں ٹھیکروں کے بھاؤ بکتے یا وقت کے ہاتھوں مٹتے دیکھیں۔ ان کتابوں کی باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔

کتابوں اور کتاب گھروں کی یہ تیرتھ یاترا مجھے سندھ سے دکن تک اور بہار سے راجستھان تک لیے پھری اور یہ میرا شرف کہ مجھے طرح طرح کے کتب خانے دیکھنا نصیب ہوا۔ جہاں کہیں میں خود نہ جا سکا، ان کا احوال دوسروں کی زبانی سُنا۔ اس کے باوجود کتنے ہی ایسے گوشے باقی رہ گئے

جہاں نہ تو میری رسائی ہوئی نہ وہ میرے علم میں آئے اس لیے مجھے اعتراف ہے کہ میری فہرست ادھوری ہے۔ یوں بھی اس گفتگو کا مقصد برصغیر کے تمام کتب خانوں کی مکمل فہرست ترتیب دینا نہیں بلکہ اس بنیادی سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے کہ ہماری کتابیں کس حال میں ہیں، اور اگر وہ حال اچھا نہیں تو پھر اس کا کیا علاج ہو؟

تو آئیے ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ برصغیر میں کتابیں اور دستاویزیں کہاں کہاں محفوظ ہیں۔

سب سے پہلے تو وہ سرکاری کتب خانے آتے ہیں جن میں قومی اور پبلک کتب خانے دونوں ہی شامل ہیں۔ سرکار انگلشیہ نے جب برصغیر میں بڑے کتب خانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی نگاہ ہندوستان کے دو بازوؤں پر پڑی۔ بڑی لائبریریوں کے قیام کے لیے ایک جانب انہوں نے کلکتے کو چُنا اور دوسری طرف لاہور کو۔

کلکتے کا کتب خانہ بالآخر ہندوستان کا قومی کتب خانہ قرار پایا اور اگرچہ اس کی راہ داریوں میں بھی یہی شکایت گونجا کرتی ہے کہ ناشر اپنی کتابیں وہاں نہیں بھیجتے اور کتابیں لازماً جمع کرانے کے قانون کی پروا نہیں کرتے، پھر بھی ایشیا کا یہ بھاری بھرکم کتب خانہ مسلسل پھلتا پھولتا نظر آتا ہے۔

لاہور میں شاہ جہاں کے دَور کی شاندار بارہ دری کو کتب خانہ میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح پنجاب پبلک لائبریری وجود میں آئی جس کے قیام کو ایک سو سال پورے ہو رہے ہیں مگر بدقسمتی سے یہ سو سال کی داستان، مسلسل زوال کی داستان ہے۔

اسی قسم کے کتب خانوں میں کراچی کی لیاقت میموریل لائبریری، خیرپور اور بہاول پور کے کتب خانے اور لاہور کی سردار دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری بھی آتی ہے اور اسی شہر لاہور کو اب چند نئے اور بڑے کتب خانوں کے قیام کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

ہندوستان یوں تو کتب خانوں سے بھرا پڑا ہے مگر مشرقی علوم کے تعلق سے وہاں کم سے کم

تین ایسے سرکاری کتب خانے ہیں جن پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ اُن میں اوّل خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ہے۔ اس کے بعد یو پی کی رام پور رضا لائبریری ہے اور تیسرا شاندار ذخیرہ جو ابھی تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے راجستھان کے شہر ٹونک میں ہے اور وہ ہے "عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ"۔

ان سب میں علامہ اقبال کے بقول، خزانے علم و حکمت کے اور کتابیں اپنے آبا کی بھری پڑی ہیں اور منتظر ہیں کہ کوئی قدر شناس آئے اور ان جوہروں سے اپنے علم کا دامن بھر بھر لے جائے۔ ان اداروں کی داستانیں بھی ہمارا موضوع بنیں گی۔

اس کے بعد آتے ہیں تعلیمی اداروں کے کتب خانے۔

ویسے تو ہر کالج اور یونیورسٹی سے ایک نا ایک کتب خانہ منسوب ہے مگر پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی اور ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے ایسے ہیں کہ دیکھا ہی کیجئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں اُردو کے اُستاد اور محقق گوپی چند نارنگ کہتے ہیں :

"علی گڑھ میں تین یا چار کلکشن بہت ہی زبردست اہمیت کے ہیں۔ سبحان اللہ کلکشن، حبیب گنج کلکشن، سید سلیمان ندوی کلکشن اور ابھی حال ہی میں اُردو کے بہت بڑے اسکالر اور محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی بہت سی کتابیں اور مخطوطات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیئے گئے اور اس ذخیرے کا نام مسعود حسن رضوی کلکشن ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کے اس ذخیرے سے نہ صرف علی گڑھ کے طالب علم استفادہ کرتے ہیں بلکہ ملک کے کونے کونے سے بھی لوگ وہاں پہنچتے ہیں اور دوسرے ممالک سے بھی"۔

تعلیمی اداروں کے بعد وہ کتب خانے آتے ہیں جو تحقیقی اداروں سے وابستہ ہیں اور خوش قسمتی سے برصغیر میں جیسے جیسے تحقیقی ادارے کھل رہے ہیں، اُسی رفتار سے جدید کتب خانے بھی قائم

ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ پاکستان میں اقبال اکیڈیمی، بھارت میں غالب اکیڈیمی اپنے اپنے کتب خانے قائم کر رہی ہیں۔ تحریک آزادی کے موضوع پر علیحدہ تحقیقی کتب خانے کھل رہے ہیں اور ادبیات کے عنوان سے کتنے ہی کتب خانے وجود میں آئے ہیں۔

عجب اتفاق ہے کہ سندھ کے قدیم شہر حیدر آباد کو تین بڑے تحقیقی اداروں اور ان سے منسلک کتب خانوں کی ملکیت کا اعزاز حاصل ہے۔ اوّل جامعہ سندھ کا انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی ہے، دوئم سندھی ادبی بورڈ ہے جس کے پاس نایاب کتابوں کا خزانہ ہے اور ان سے بھی بڑھ کر حیدر آباد سندھ کی شاہ ولی اللہ اکیڈیمی ہے جہاں تاریخ اسلام پر اتنی نایاب کتابیں جمع ہیں کہ اس خطے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی کے بارے میں خود اس کے نگراں علامہ غلام مصطفےٰ قاسمی نے بتایا:

"ہمارے ہاں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ خطی کتابیں بھی ہیں۔ جوناگڑھ کے قاضی اختر صاحب برصغیر کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی جتنی نادر کتابیں تھیں وہ شاہ ولی اللہ اکیڈیمی نے حاصل کر لیں۔ اس لحاظ سے اسلام پر، تاریخ اسلام پر ہمارے ادارے میں جو کتابیں ہیں، اور ان میں انگریزی کتابیں بھی شامل ہیں، وہ اتنی نایاب ہیں کہ ان سے استفادے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔"

تحقیقی اداروں کے بعد آرکائیوز اور میوزیم آتے ہیں۔ آرکائیوز اصولاً دفتر خانے ہوتے ہیں اور سرکاری دستاویزیں محفوظ رکھنے کے ذمّے دار ہوتے ہیں لیکن برصغیر کے کئی آرکائیوز پرانی کتابوں کو بھی اپنے تحفظ میں لے رہے ہیں۔ نئی دہلی میں ہندوستان کا قومی آرکائیوز اب بھی قدیم کتابیں خرید کر محفوظ کر رہا ہے، اور سب سے بڑا کام حیدر آباد دکن میں آندھرا پردیش کے صوبائی آرکائیوز نے کیا ہے۔ اُس نے کتب خانہ آصفیہ کی تمام قلمی کتابیں اپنی تحویل میں لے کر محفوظ کر لی ہیں ورنہ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو چھپی ہوئی کتابوں کا ہو رہا ہے۔ اس آرکائیوز کے متعلق ڈاکٹر ضیا الدین احمد شکیب نے ہمیں بتایا

جو کتابوں اور کاغذوں کے اس سمندر میں بارہا غوطے لگا چکے ہیں۔ انہوں نے کہا :

"حیدرآباد میں آندھرا پردیش کے آرکائیوز میں دو کروڑ کاغذ تو مغلوں کے ہیں اور ان کے علاوہ بہمنیوں کے، قطب شاہوں، عادل شاہوں اور برّی شاہوں اور انگریزوں کے بہت سے کاغذ ہیں۔ قدیم ترین کاغذ تو اُس دَور کے ہیں جب ابھی تیمور زندہ تھا اور فیروز شاہ بہمنی کا فرمان ۱۴۰۶ء کا ہے، جو مَیں سمجھتا ہوں کہ قدیم ترین کاغذ ہے جو سرکاری اداروں میں محفوظ ہے۔"

جہاں تک میوزیم کا تعلق ہے، کراچی اور دہلی کے قومی عجائب گھروں میں قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور برِّصغیر کے کتنے ہی عجائب گھروں میں تاریخ کی ایسی ایسی دستاویزیں محفوظ ہیں جن کی قیمت لگانا مشکل ہے۔ لیکن چھپی ہوئی اور قلمی کتابوں کا ایک عظیم الشّان خزینہ حیدرآباد دکن کے سالار جنگ میوزیم میں ہے جسے وہ اتنے اہتمام سے رکھتے ہیں کہ دوسرے عجائب گھروں کو ان کی تقلید کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد ہم آتے ہیں ذاتی یا نجی کتب خانوں کی طرف۔ ان کے مالک تین قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جو خاندانی ذخیروں کو لیے بیٹھے ہیں۔ ایک وہ جنہیں علم اور کتابوں سے لگاؤ ہے اور ساتھ ہی صاحبِ حیثیت بھی ہیں اس لیے اُن کے گھر کتابوں سے بھر گئے۔ اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو صاحبِ حیثیت نہیں مگر کتابوں کے پیچھے دیوانے ہیں اور نہ معلوم کیسے کیسے جتن کر کے اپنے کتب خانوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔

یہ ذاتی یا نجی کتب خانے دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جن کے دروازے بند ہیں اور دوسرے وہ جو ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔

ذاتی کتب خانوں کے بعد وہ ادارہ آتا ہے جس کا تذکرہ اگرچہ آخر میں مگر جو اوّلیت کے معاملے میں بہت اوپر ہے اور وہ ہیں ہماری مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں۔ دینی مدرسے تو پورے برِّصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نامور مدرسے رہے ایک طرف، بعض چھوٹے مدرسوں میں بھی علم و حکمت

کے ایسے ذخیرے موجود ہیں کہ باہر کی دنیا کو ابھی اُن کا علم ہی نہیں۔ مسجدوں کا عالم یہ ہے کہ چونکہ اُن میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی تھا اس لیے ان کے اپنے کتب خانے بھی تھے۔ ان کی فہرست طویل ہے لیکن بھوپال کی تاج المساجد اور بمبئی کی جامع مسجد میں کتابوں کا بے مثال ذخیرہ موجود ہے، مگر یہ کتابیں برسوں استفادہ کرنے والوں کی راہ تکا کرتی ہیں اور کوئی نہیں آتا۔ ان کی قدر نہ کی گئی تو ان کتابوں کی باتیں محض خوابوں کی باتیں رہ جائیں گی۔

اولیاء اور صوفیاء نے، مشائخ اور درویشوں نے بھی جہاں علم کے موتی لٹائے وہیں خود بھی علم کے خزانے جوڑے اور کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے جمع کیے۔ ایسے ہی ایک ناقابلِ یقین کتب خانے کے بارے میں اجمیر کے ڈاکٹر ظہور الحسن شارب نے بتایا:

"گجرات کے اندر شاہ وجیہ الدین صاحب ایک بہت ہی مشہور درویش ہوئے ہیں۔ وہ درویش ہی نہیں تھے بلکہ بڑے عالم بھی تھے، اور خود ایک مدرسہ چلاتے تھے۔ اُن کے پاس کتابوں کا ذخیرہ اٹھارہ ہزار بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگ ستائیس ہزار کہتے ہیں۔ بہرحال یقینی بات ہے کہ ایک اچھا خزانہ تھا اور سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کتب خانہ صرف دو موضوعات پر مشتمل تھا، یعنی تفسیر اور حدیث۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کتابیں چاہے اٹھارہ ہزار ہوں یا اس سے بھی کم، صرف دو موضوعات پر اتنا بڑا ذخیرہ ہونا بہت بڑی بات ہے۔"

برصغیر کی درگاہوں میں، تکیوں اور گدیوں میں ان گنت کتابیں موجود ہیں لیکن اب اُن میں سے زیادہ تر کتب خانوں کی حالت اچھی نہیں۔ کتنے ہی کتب خانوں کو تو پیروں فقیروں کی دعائیں بھی نہ بچا سکیں۔ شاید اُن کی دعاؤں میں اک ذرا سا پھیر تھا۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ خدا اِن کتابوں کو بچائے۔ انہیں کہنا چاہیے تھا کہ خدا اپنے بندوں کو یہ کتابیں بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

عِلم کی وادی

جن دنوں میں برِصغیر کے کتب خانوں کے سفر پر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، اُن ہی دنوں ایک روز فیض احمد فیضؔ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے فیض صاحب کو بتایا ہم لوگ ایک دستاویز ترتیب دیں گے جس میں دیکھیں گے کہ ہماری قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ میری بات سُن کر فیض صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں نے بتایا کہ میں برِصغیر میں ایک مہینے کام کروں گا۔ اُن کے سننے میں مغالطہ ہوا۔ فیض صاحب ایک مہینے کو ایک سال سمجھے اور کہنے لگے کہ اتنے بڑے کام کے لیے ایک سال تو بہت کم اور ناکافی ہوگا۔

وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔

میں نے پاکستان اور ہندوستان کا سفر شروع کیا تو احساس ہوا کہ چھوٹے بڑے کتب خانوں کا حال جاننے کے لیے ایک سال نہیں، ایک عمر درکار ہے اور عمر بھی ایسی کہ جس میں ہر برس کے پچاس ہزار دن ہوں۔

بہرحال، میں جتنی بھی معلومات سمیٹ سکتا تھا، بٹور لایا۔ اب میرے سامنے کتابوں اور کتابچوں

کے، نوٹس، خطوں، مضامین اور تراشوں کے انبار لگے ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں تمام کروں۔

ہر چند کہ وہ زمانہ گیا جب گھر گھر کتب خانے ہوا کرتے تھے اور اُمرا، کو تو جانے دیجئے، غریب غربا تک، جیسے بھی بن پڑتا تھا، گھر کے ایک طاق میں کچھ نسخے ضرور سجا لیا کرتے تھے۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب خوشنویس راتوں کو چراغ کی روشنی میں کتابیں نقل کر کر کے بیچا کرتے تھے، اُن دنوں کوئی گھر کتابوں سے خالی نہ تھا مگر جب راتوں رات چھاپ کر ارزاں کتابوں کے ڈھیر لگا دینے والا چھاپہ خانہ آیا تو کتابوں کا ذوق جاتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کے جانے کی آہٹ ابھی نہیں گئی ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سُننے میں آ رہی ہے، اس کے پیروں کے نقش ماند سہی مگر باقی ہیں۔ تو آیئے آج وہی نقوش دیکھنے چلیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، پورے برصغیر کی بات کرنے کے لیے تو ایک عمر بھی ناکافی ہو گی اس لیے ہم یوں کرتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کا ایک ایک صوبہ چُن لیتے ہیں تاکہ اس علاقے کے گھر گھر اور گاؤں گاؤں جا کر پرانی کتابوں کا سراغ پانے کی کوشش کریں۔ ایک ایک صوبہ چننے کا مقصد یہ ہے کہ اُسے نمائندہ مان کر دوسرے علاقوں کی صورتِ حال کا بھی اندازہ ہو جائے۔ اس مفصل گفتگو کے لیے ہم نے پاکستان کا صوبہ سندھ اور ہندوستان کی ریاست مدھیہ پردیش چُنی ہے جس کا علاقہ بھوپال، برصغیر میں مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست رہا ہے اور جہاں علم کا چرچا رہا ہے اور حکمت کی سرپرستی ہوئی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں حیدرآباد دکن کا انتخاب کرنا چاہیئے تھا لیکن اس کے احوال کو ہم نے ایک باب میں مقید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دکن کا تذکرہ تو پوری گفتگو میں پھیلا ہوا ہے اور قدم قدم پر اُس کا نام آنا ناگزیر ہے۔

دو صوبوں کی گرد چھاننے اور اُس میں دبی ہوئی اپنے آبا کی کتابیں دیکھنے کے بعد ہم برصغیر کے دوسرے علاقوں کا رُخ کریں گے۔ شہروں اور بستیوں میں جائیں گے۔ تعلیمی اداروں کے اندر بھی چلیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیسے کیسے عجائبات روپوش ہیں کہ عرف عام میں جنہیں کتاب

کہا جاتا ہے۔

سندھ کی بات کرتے ہوئے ہم نے کراچی کو الگ رکھا ہے۔ اس کے لیے ہم ایک علیحدہ باب قائم کریں گے۔ سندھ کی اس گفتگو میں ڈاکٹر غلام علی الانا کا نام بار بار آئے گا جو سندھ کے بڑے عالم، محقق اور سندھی ادب اور لسانیات کے اُستاد ہیں اور اس تحقیق کے وقت انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی کے نگراں تھے۔ ان کا تعاون نہ ہوتا تو یہ مقالہ بھی نہ ہوتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی میں صرف سندھ کے موضوع پر پچپن ہزار کتابیں جمع ہیں اور ان میں زیادہ تر اب نایاب ہیں۔ جام شورو میں سندھ یونیورسٹی سے وابستہ اِس ادارے میں بہت بڑے کتب خانے کے ساتھ ساتھ قدیم کتابوں کو محفوظ کرنے کے وہ تمام انتظامات بھی ہیں جو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

وہاں فیومی گیشن چیمبر ہیں جن کے اندر رکھی ہوئی پرانی کتابوں کے کیڑے مکوڑے ختم ہوجاتے ہیں، سیلن نکل جاتی ہے اور پرانا کاغذ گلنے سے بچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کتاب کے ہر ورق پر جھلی جیسا کاغذ چڑھانے کا بندوبست بھی ہے جس کے بعد پرانا کاغذ صدیوں کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی میں کتابوں کے ایک ایک صفحے کی چھوٹی سی فلم بنانے کے جدید انتظامات بھی ہیں اور اس مائیکرو فلمنگ کے علاوہ ہر صفحے کی فوٹو کاپی اتارنے کے آلات بھی لگے ہیں۔ پرانی کتابوں کی از سر نو جلد بندی ہوتی ہے اور قابلِ ذکر اور قابلِ دید کتابوں کو شوکیسوں میں سجا دیا جاتا ہے اور وہیں اس کتاب کے بارے میں تمام ضروری معلومات تحریر کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہاں سینکڑوں کتابیں ایسی ہیں کہ انہیں پڑھنا تو رہا ایک طرف، دیکھنا ہی نصیب ہو جائے تو خود کو خوش نصیب جانیے۔

انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی کو ملا کر، صوبے میں اس نوعیت کے تین ادارے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر الانا نے بتایا :

"ان میں سب سے سینئر ادارہ سندھی ادبی بورڈ ہے۔ اس کے بعد ہے انسٹی ٹیوٹ

آف سندھالوجی۔ اس کے بعد ہے خیرپور کی پبلک لائبریری۔ ان تینوں اداروں میں جہاں تک قلمی نسخوں کا تعلق ہے تو سندھی ادبی بورڈ اوّل ہے۔ وہاں سب سے پرانے نسخے ہیں کیونکہ وہ پرانا ادارہ ہے۔ اس کے بعد سندھ کے عالموں اور فاضلوں کی لکھی ہوئی کتابیں سندھالوجی میں ملیں گی لیکن خیرپور کی لائبریری بھی کم نہیں کیوں کہ تعداد کے لحاظ سے وہاں قلمی نسخے زیادہ ہیں۔ اس لائبریری میں تالپور حکمرانوں کے زمانے کا کلکشن موجود ہے۔ وہاں خود سندھ کے متعلق کتابیں اتنی زیادہ نہیں لیکن برصغیر کے قلمی نسخے وہاں زیادہ ہیں۔"

حیدرآباد سندھ کے بڑے کتب خانوں میں شاہ ولی اللہ اکیڈیمی کی لائبریری قابلِ ذکر ہے۔ اس میں خود شاہ صاحب کی تصانیف کے علاوہ اسلام اور تاریخ اسلام پر مخطوطہ اور مطبوعہ کتابوں کا ایسا نادر ذخیرہ محفوظ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں تحقیق کرنے والوں کو بھی اپنی بات تکمیل کو پہنچانے کے لیے وہاں جانا پڑتا ہے۔

سندھ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے اور وہاں پانچ چھ سو قلمی کتابیں موجود ہیں جن کی اب مائیکرو فلم بنائی جارہی ہے تاکہ اُن کا عکس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد میں صوبائی میوزیم کے پاس بھی بہت سی نایاب کتابیں ہیں اور انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو قلمی نسخوں کا ایک ذخیرہ حال ہی میں خریدا ہے۔ حیدرآباد شہر میں پاکستان نیشنل سنٹر کا کتب خانہ بھی ہے جہاں تقریباً بیس ہزار نئی اور پرانی کتابیں ہیں۔

ان سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے بعد اب ہم آپ کو سندھ کے ایک عجیب و غریب کتب خانے کے بارے میں بتاتے ہیں جو پتھریلے میدانوں اور سنگلاخ چٹانوں کے پچھواڑے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹڑی محمد کبیر میں ہے اور علم کا یہ ذخیرہ دنیا کی نگاہوں سے روپوش ہے۔

کوٹڑی محمد کبیر نواب شاہ میں، نیشنل ہائی وے پر ایک قدیم گاؤں ہے جہاں کبھی مخدوم شیخ محمد کبیر اور سخی شیخ اللہ یار کی درس گاہیں تھیں اور اب ان دو بزرگوں کی درگاہیں ہیں۔ وہاں پرانی درسگاہوں

کی کتابیں ابھی تک موجود ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر الانا نے کہا :

" وہاں میری نظر میں سب سے زیادہ قیمتی اور نایاب کتابیں مخطوطوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ کوٹڑی محمد کبیر ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کے بزرگوں نے صدیوں پہلے کتابیں اکٹھا کرنا شروع کی تھیں اور مشہور ہے کہ سندھ کے بزرگ شاعر شاہ لطیف بھی وہاں گئے تھے اور انھوں نے بھی کچھ کتابیں دیکھی تھیں۔"

کوٹڑی محمد کبیر کے اس کتب خانے کے بارے میں پہلے یہ سنا جاتا تھا کہ وہاں کتابوں کی حالت اچھی نہیں کیونکہ وہاں قدیم کاغذوں کے تحفظ کا انتظام نہیں۔ لیکن اب سنا جاتا ہے کہ درگاہوں کے سجادہ نشین پیر زادہ میاں غوث محمد گوہر ان نایاب کتابوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کام کے لیے متعلقہ اداروں کی مدد لے رہے ہیں۔

کوٹڑی محمد کبیر کے بعد سندھ میں نایاب کتابوں کا دوسرا بڑا ذخیرہ بھی ایک چھوٹے سے قصبے منصورہ میں ہے۔ منصورہ کا دینی علوم کا مدرسہ، جہاں یہ کتابیں موجود ہیں، عالم اسلام میں بہت مشہور ہے چنانچہ اس میں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے طالب علم بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور ذخیرہ سندھ کے ایک گاؤں پیر جھنڈو شریف میں تھا۔ وہاں برطانیہ، ترکی اور مصر کے کتب خانوں سے نایاب کتابوں کی نقلیں منگا کر جمع کی گئی تھیں۔ اب یہ کتب خانہ نیشنل میوزیم کو دے دیا گیا ہے۔

سندھ میں دو اور ایسے پرانے مدرسے ہیں جہاں دینیات اور سیرت پر نایاب کتابیں اور مخطوطے پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر الانا نے بتایا :

" خیر پور میرس کی طرف ایک چھوٹا سا شہر ہے ٹھیڑھی جہاں جامعہ دار الہدیٰ ہے۔ اس مدرسے میں بھی پانچ چھ سو قلمی نسخے موجود ہیں جو دینیات اور فقہ پر بڑی نادر کتابیں ہیں۔ اسی طرح اگر ہم زیریں سندھ میں جائیں تو وہاں میر پور بٹھورو کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "چنہاں" جس کو سومرو بھی کہتے ہیں، وہاں بھی ایک پرانا مدرسہ

ہے۔ اس میں قدیم زمانے کے سندھی کاتبوں کی لکھی ہوئی فقہ اور سیرت پر کتابیں ملتی ہیں۔

اسی طرح ضلع ٹھٹھہ کے ایک گاؤں پوہڑ جمالی میں شاہ بندر ادبی سوسائٹی کا کتب خانہ اور اسی علاقے میں مدرسہ ہاشمیہ سجاول کا کتب خانہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ضلع سانگھڑ کے دیہات میں بھی دو بڑے کتب خانے ہیں۔ اُن میں سے ایک چوٹیاریوں اور دوسرا ڈیھروں نامی گاؤں میں ہے جو سادات کا بڑا کتب خانہ تصور کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد سے تقریباً بیس میل دُور ٹنڈو سائیں داد میں سرہندی بزرگوں کا ایک بڑا کتب خانہ ہے جس میں مخطوطات اور نوادر کا ذخیرہ ہے۔

لاڑکانہ کے قریب پیر جو گوٹھ میں پیر نجیع اللہ شاہ کا کتب خانہ موجود ہے، جو بڑا علمی سرمایہ ہے۔ اسی نام کا ایک گاؤں خیر پور میرس کے قریب ہے۔ جس میں پیر صبغت اللہ شاہ مرحوم کی کتابیں اور اُن کے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ زیادہ تر کتابیں حدیث، تاریخ، صرف و نحو، فقہ اور لسانیات کے موضوع پر ہیں۔ دو بڑے دینی مدرسے کراچی کے علاقوں کھڈہ اور ملیر میں موجود ہیں، جو مخطوطوں اور نایاب کتابوں سے مالامال ہیں۔ ایک اور مدرسہ بھی ہے جو کہ جناب مولانا عبدالحق ربّانی کا ہے اور یہ میر پور خاص کے قریب واقع ہے، وہ بھی قیمتی کتابوں سے خالی نہیں ہے۔

یہ تھا سندھ کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور مدرسوں میں موجود تاریخ کے شہ پاروں کا ایک جائزہ۔ بلاشبہ اس میں کئی نام اور مقام شامل ہونے سے رہ گئے، اور یہ مقام معذرت طلبی کا ہے۔

آئندہ باب میں ہم نایاب کتابوں کے اُن ذخیروں کی بات کریں گے جو صوبہ سندھ کے امیروں، رئیسوں، عالموں، سیاست کاروں اور غریبوں کے گھروں میں، ان کی اپنی ذاتی

ملکیت میں موجود ہیں۔ ان میں سے کئی کتب خانے تباہ ہو رہے ہیں۔ کئی کو بچا لیا گیا ہے۔ اور کتنے ہی کتب خانے ایسے ہیں جنہیں ہم اور آپ دیکھ ہی نہیں سکتے البتہ جانتے ہیں کہ وہاں تاریخ کی ایسی ایسی نادر یادگاریں موجود ہیں کہ انھیں خدانخواستہ نقصان پہنچا تو پھر تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

عبادت جاری ہے

سندھ کے دیہات اور قصبوں کی بات تو ہو چکی جہاں دینی مدرسوں میں قدیم کتابوں کے ایسے ایسے خزانے موجود ہیں کہ اگر انھیں بچایا نہ گیا تو ہمارے یہی آب و ہوا جن میں ہم جیتے ہیں ، ہمارے بزرگوں کی ان کتابوں کو مار ڈالیں گے۔

آج کے سفر میں ہم سندھ کے مختلف گھرانوں میں چلیں گے اور دیکھیں گے کہ لوگ اس ورثے کو کس طرح سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کتنے ہی ذخیرے خاک ہوئے اور خواب ہوئے۔ اور ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جنھیں ہم دیکھ بھی نہیں سکتے۔

سندھ ہمیشہ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کے حکمراں عالموں کی سرپرستی کرتے رہے ہیں. اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف مدرسے بلکہ اہل علم کے گھرانے اور حکمراں خاندانوں کی ڈیوڑھیاں آج بھی ایسی ایسی کتابوں سے بھری پڑی ہیں جن کے صفحوں پر حکمت و دانش بکھری ہوئی اور وہ بھی سونے چاندی کے پانی میں گھلی ہوئی۔

مغلوں کے عہد میں شہر ٹھٹھہ اتنا خوش حال اور آسودہ تھا کہ نہ صرف برصغیر بلکہ سمندر پار

سے بھی ارباب علم و قلم کھنچے کھنچے ٹھٹھہ چلے آتے تھے۔ لیکن جب مغلوں کا عروج اور دریا کا کنارہ، دونوں اس شہر کو چھوڑ گئے تو یہ کھنڈر بن کر رہ گیا۔

ایسے کھنڈروں کو کریدنے اور گزرے وقتوں کی یادگار نشانیاں نکال کر لے جانے والوں کی کمی نہیں چنانچہ ٹھٹھہ لٹتا رہا۔ کہتے ہیں کہ وہاں بعض گھرانوں میں قدیم کتابیں اب بھی موجود ہیں مگر وہ لوگ اپنا یہ ورثہ دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

یہ احتیاط مجھے کئی جگہ نظر آئی۔ میں حیدرآباد پہنچا تو ڈاکٹر غلام علی الانا نے مجھ سے کہا :

" آپ حیدرآباد آئے ہیں تو کوشش کریں کہ یہاں جو تالپور حکمراں تھے، ان کے گھرانے کا ذخیرہ دیکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کے اس علاقے میں سابق حکمرانوں کا سب سے اچھا ذخیرہ تالپور گھرانے میں ہے۔ نادر شاہ جب سندھ میں آئے اور کلہوڑہ خاندان سے صلح کی تو وہ صلح نامہ قرآن شریف پر لکھا گیا تھا۔ قرآن کا وہ نسخہ وہاں موجود ہے۔ اسی طرح خطّاطی کے بے مثال نمونے، قرآن مجید کے نسخے اور مصوری کا جو ذخیرہ تالپور خاندان کے پاس ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں۔ مگر وہ دکھانے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ایک دفعہ اُن پر کچھ ایسی سختی ہوئی، جس کے بعد وہ محتاط ہو گئے۔ اسی طرح خیرپور کے حکمراں خاندان کے پاس بھی اچھے ذخیرے ہیں "

حیدرآباد شہر کے اندر نایاب کتابوں کا ذخیرہ مرزا عبّاس علی صاحب کے پاس ہے۔ وہ خود تو رئیس اور مالدار نہیں لیکن ان کے خاندان کا تعلق تالپور حکمرانوں سے رہا ہے چنانچہ ان کے پاس خود تالپور گلگشن کی اور تالپوروں کے وزیروں کی کتابیں موجود ہیں۔ مرزا عباس علی صاحب کے بارے میں بھی یہی روایت ہے کہ کچھ بااثر لوگوں کو اُن کے کتب خانے کا علم ہوا تو انھوں نے کتابیں حاصل کرنے کے لیے مرزا صاحب پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا۔ ڈاکٹر الانا کا خیال ہے کہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کتابیں عام لوگوں کو نہیں دکھاتے لیکن شہر کے کچھ اہلِ علم حضرات کو یہ کتابیں اتنے اشتیاق سے دکھاتے ہیں کہ تھیلا بھر کر خود ان کے گھروں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں بعض اوقات رات رات بھر مطالعہ

جاری رہتا ہے۔

مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کے ڈیرے میں قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے لیکن وہ باہر والوں کے لیے کھلا ہوا نہیں۔

یہ تو خیر پورے پورے کتب خانوں کی بات تھی۔ آیئے اب آپ کو ایک تنہا کتاب کا قصہ سنائیں جس کے راوی ڈاکٹر الانا ہیں :

"جاتی ایک قصبہ ہے، وہاں ایک درگاہ ہے جس میں ایک پُرانا قلمی نسخہ موجود ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کتاب درگاہ سے منسوب ہے لہٰذا وہ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے حالانکہ وہاں کے سجادہ نشین میرے بہت اچھے دوست ہیں، بالکل بھائیوں کی طرح ہیں۔ مَیں جاتا ہوں تو بڑی عزت کرتے ہیں لیکن جوں ہی اُس قلمی نسخے کی بات آتی ہے تو اس کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ایسی دوستی ہم نہیں رکھتے۔"

اس معاملے میں ایک بڑا فراخ دل گھرانا شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ کا ہے۔ مرحوم کی کتابوں کا ذخیرہ اُن کے بیٹے کے پاس محفوظ ہے جسے عام قاری دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں سینکڑوں کتابیں خود میرزا کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ سندھ کا قدیم گھرانا ہے جس میں میرزا خسرو بیگ تالپوروں کے وزیر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہاں نادر کتابیں موجود ہیں۔

ذاتی کتب خانوں میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کا ذخیرہ بے مثال ہے، جیّد عالم ہیں اُسی مناسبت سے نہایت اعلیٰ مخطوطے جمع کیے ہیں جو نادر و نایاب ہیں۔

سندھ کے مشہور شہر سیہون میں حکیم محمد مراد صاحب کے پاس قدیم کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ ویسے تو وہ طبیب ہیں لیکن اُن کا تعلّق عباسی خاندان سے ہے اور ممکن ہے کہ بزرگوں سے چلتی ہوئی بہت سی کتابیں حکیم صاحب تک پہنچی ہوں۔

لاڑکانہ کے قریب شہر دگھن ہے اور اس کے پاس پیر جو گوٹھ۔ اُس میں جو پیر صاحب

ہیں اُن کا تعلق راشدی خاندان سے ہے اور پیر پگارڑو کے عزیز بھی ہیں۔ اُن کے بارے میں ڈاکٹر الانا نے بتایا:

"پیر صاحب کی عمر بیانوے برس ہے لیکن وہ بالکل جوانوں جیسے نظر آتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ آج تک جاری ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ پچھلے سال تک اُنھوں نے کوئی پینتالیس سو کتابیں پڑھی ہیں جو اب انھوں نے ایک جگہ عطیے کے طور پر دے دی ہیں۔ لیکن اب بھی ان کے پاس تقریباً پندرہ سو قلمی نسخے ہیں۔"

اسی طرح شہر مورو ہے، جو قومی شاہراہ پر واقع ہے۔ مورو کے قاضی اپنے فتوے کی وجہ سے مشہور ہیں، وہاں بھی نایاب کتابیں ملتی ہیں۔ ٹنڈو محمد خاں سے بیس پچیس میل جنوب مغرب میں ایک گاؤں ہے کھوڑوا۔ وہاں ایک عالم و فاضل گھرانہ ہے جس کا کتب خانہ نورنگ زادہ کے کتب خانے کے نام سے مشہور ہے۔ اُس میں بھی نہایت بیش قیمت کتابیں موجود ہیں۔

سندھ کے شہر شکارپور کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ اب وہ اپنی عظمت سے محروم ہے لیکن گزرے دنوں کی نشانیوں سے محروم نہیں۔ شکارپور میں بہت سے لوگوں کے پاس نایاب کتابیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک علوی گھرانا اور ایک صدیقی گھرانا ہے جن کے اپنے کتب خانے ہیں۔ اسی طرح وہاں ایک چشتی گھرانے کی کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن اس علاقے کے جس شاندار کتب خانے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ گڑھی یاسین کا کتب خانہ ہے جو بہت اچھی حالت میں ہے اور جہاں کتابیں جدید طریقے سے خانہ بندی کر کے رکھی گئی ہیں۔ اس کی عمارت بطورِ خاص تعمیر کرائی گئی تھی جہاں تحقیق کرنے والوں کے لیے طعام و قیام کا بندوبست بھی تھا۔ برصغیر میں اس قسم کے رہائشی کتب خانے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ خیرپور میں لطف اللہ بدوی مرحوم کے بیٹوں کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے جس میں نایاب قلمی نسخے شامل ہیں۔ نصرپور، ہالہ اور سیہون سندھ کے قدیم شہر ہیں جہاں بعض گھرانوں میں پرانی کتابیں ملتی ہیں۔ اسی طرح روہڑی اور بھکر میں کچھ ایسے خاندان ہیں جو عہد معصومین سے

وہیں آباد ہیں۔ان کے پاس قدیم کتابیں یقیناً ہوں گی۔سکھر میں کچھ گھرانے ہیں جن میں خلافت تحریک کے پمفلٹ، پوسٹر اور خطوط محفوظ ہیں۔میر پور بٹھورو میں ایک صاحب کے پاس پرانے اخباروں کا ذخیرہ ہے۔ ٹھل، جیکب آباد اور میر پور خاص میں بھی اخباروں کے بہت اچھے ذخیرے ہیں۔

شہر بدین میں مولانا احمد ملھا کا، جنھوں نے قرآن کا منظوم ترجمہ کر کے نام پایا، قدیم کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔بدین میں مولوی عبداللہ صاحب کے پاس بھی ان کا ذاتی کتب خانہ ہے۔ٹنڈو محمد خان میں دو بھائی تھے، سلطان علی اور محب علی۔ان دونوں کو نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کا لاجواب ذخیرہ موجود ہے اور اب اسے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ وہیں سندھ کے میروں کی کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔خیر پور میرس میں ڈاکٹر گھومرو کے ذاتی کتب خانے میں بیش قیمت کتابیں ہیں۔ اب ان کی مائیکرو فلم بنائی جا رہی ہے۔حیدر آباد میں محمد خاں غنی صاحب کا کتب خانہ بھی قابلِ ذکر ہے۔

ذاتی کتب خانے قائم کرنے والوں میں دورِ حاضر کی کتنی ہی شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔مولانا قاسمی کا ذکر تو ہو چکا، ان کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، جی ایم سید، میر علی احمد تالپور، شیخ ایاز، پیر حسام الدین راشدی، مولانا امین اللہ علوی اور محمد سعید صدیقی صاحبان نے اس راہ میں بڑا کام کیا ہے۔

اب آخر میں آپ کو سندھ کے ایک ایسے ذاتی کتب خانے کی داستان سنائیں جو کتابوں سے مالامال تھا مگر خاک میں پنہاں ہو گیا۔اُس کا احوال بھی ڈاکٹر غلام علی الانا نے سنایا:

"کندھ کوٹ سے دس میل جنوب میں ایک گاؤں ہے غوث پور۔اس میں الٰہ بچایو شاہ ہوا کرتے تھے۔اُن کے سسر دھنی بخش کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔اُن کے پاس کافی کتابیں تھیں، تقریباً چار پانچ ہزار قلمی نسخے اور مطبوعہ۔ان میں قلمی نسخے زیادہ تھے۔میں کتابوں کو بچانے کے لیے چار پانچ سال سے ان سے خط و کتابت کر رہا تھا، اسی دوران اُن کا انتقال ہو گیا۔حال ہی میں میرا جانا ہوا تو اُن کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔وہ لائبریری اب ختم ہو گئی ہے کیونکہ کچھ بڑے لوگ اُن سے کتابیں لے گئے ہیں۔کچھ ہمارے اثر و

رسوخ والے افسران لے گئے ہیں لیکن اس وقت بھی اُن کے پاس دو ہزار کتابیں ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو دیکھا کہ کتابیں ایسی حالت میں تھیں کہ مجھے رونا آگیا۔ میں بات نہیں کر سکا۔ اُن کا بیٹا نوجوان ہے جو کتابوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اُس نے مجھے اجازت دی کہ سائیں آپ کو جتنی کتابیں چاہئیں آپ لے جائیں کیونکہ ہم سے یہ سنبھالی نہیں جاتیں۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ اُن کتابوں پر اتنی گرد تھی اور اتنی دیمک تھی کہ میرے ساتھ دس افراد تھے جنھیں میں نے حویلی کی چھت پر بلایا، جہاں وہ کتب خانہ ہے، تو چار پانچ افراد گرد صاف کرنے میں لگے اور چار پانچ دیمک کو ہٹانے میں مصروف ہوئے اور خود میں کتابوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے صرف چھتیس کتابیں چھانٹ سکا۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن کی کیا حالت ہو گی۔"

اب صورتحال یہ ہے کہ جتنی بھی پرانی کتابیں ہیں، اوپر سے دیکھنے میں وہ چاہے کتنی ہی اچھی حالت میں نظر آئیں لیکن اگر ان کی دیکھ بھال جدید سائنسی طریقوں سے نہیں ہو رہی ہے تو سمجھئے کہ اب اُن کا چل چلاؤ قریب ہے۔ جو لوگ باشعور ہیں وہ اپنی اس میراث کو جو درحقیقت پورے معاشرے کی میراث ہے، اب ایسے اداروں کو دے رہے ہیں جہاں ان کتابوں کو مٹنے سے بچایا جا سکتا ہے، چنانچہ کراچی کے نیشنل میوزیم اور حیدرآباد کے سندھی ادبی بورڈ، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی اور صوبائی میوزیم میں کافی کتابیں پہنچ رہی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی نے کتابوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کے جدید سائنسی طریقے اختیار کیے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں وہاں قدیم دستاویزوں کے تحفظ کا ایک تربیتی کورس اور سیمینار ہوا تھا۔ جس میں تربیت دینے کے لیے لندن سے انڈیا آفس لائبریری نے اپنا ایک ماہر حیدرآباد میں بھیجا تھا۔

ان تمام کوششوں کو دیکھ کر اُن لوگوں کی ہمت بندھی ہے جو اپنے باپ دادا کی کتابیں کہیں محفوظ کرانے کے خواہش مند تھے۔ سندھ کے بڑے عالم دُر محمد شاہ مرحوم کا پورا کتب خانہ اُن کے

رشتے داروں نے انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی کو دے دیا۔ اسی طرح پروفیسر محبوب علی چنا، محمد ہاشم گزدر، غلام رضا بھٹو، پیر سید حسن اور علی اکبر عباسی مرحومین کی کتابوں کے ذخیرے بھی اسی ادارے کو بطورِ عطیہ مل گئے ہیں۔

حصولِ علم عبادت ہے اور خوش نصیب ہیں وہ مرنے والے جن کی عبادت، اُن کے اس جہاں سے اُٹھ جانے کے بعد بھی جاری رہے گی۔

بکھرے ہوئے ورق

جب میں نے ہندوستان کا سفر شروع کیا، فروری کا مہینہ تھا اور دھوپ بدن کو بھلی لگ رہی تھی۔ میں دلّی سے چلا اور ہاپوڑ اور امروہہ کے راستے مرادآباد پہنچا۔ میری ڈائری میں وہاں اپنے کچھ سامعین کے پتے لکھے تھے۔ میں نے نئی بستی میں محمد سلیم صدیقی صاحب کے دروازے پر دستک دی اور اگلے ہی لمحے گرمجوشی اور تپاک کا دروازہ کھل گیا۔

باتوں باتوں میں مَیں نے بتایا کہ ہندوستان میں پرانی کتابیں اور کتب خانے دیکھنے آیا ہوں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ صدیقی صاحب اُٹھے، اپنی الماری سے دو پُرانے قلمی نسخے نکالے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کہنے لگے کہ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ یہاں ضائع ہو جائے گی۔ آپ اسے ہم غریبوں کے تحفے کے طور پر قبول کرلیں گے تو یہ کتابیں محفوظ رہ جائیں گی۔

ان میں سے ایک مولوی عظمت اللہ صاحب کا "قیامت نامہ" تھا جو تقریباً ایک سو ساٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا، یہ اُس کی ڈیڑھ سو سال پرانی نقل تھی۔ اس میں قیامت کے متعلق تمام حدیثیں نظم کر دی گئی ہیں۔ دوسری کتاب "فراست نامہ رنگین" ہے جو ایک سو ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اُس

کا موضوع ہے "گھوڑوں کی مختلف بیماریاں اور اُن کا علاج" اور لُطف یہ ہے کہ سب کچھ منظوم ہے۔

اس ساری گفتگو کا مقصد صرف اتنی سی بات کہنا ہے کہ ہندوستان میں اُردو، فارسی اور عربی سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں بزرگوں کے زمانے کی ایک نا ایک پرانی کتاب موجود نہ ہو۔ میری اس رائے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آجائے۔

ہندوستان کی سرزمین پر بکھرے ہوئے تاریخ کے ان اوراق پر کوئی تفصیل سے بات کر سکے، یہ ناممکن ہے۔ بے شمار گھروں میں آج تک ایسے صندوق اور ایسے کمرے بند پڑے ہیں جن کے اندر پرانی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ہماری نسل کو ان کا خیال تک نہیں چنانچہ ان پر دیمک کی نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں۔

پاکستان میں کتابوں کے مختلف اور معلوم ذخیروں کا ایک خاکہ پیش کرنے کے لیے ہم نے نمونے کے طور پر صوبہ سندھ چُنا تھا۔ ہندوستان میں ہم نے مدھیہ پردیش اور خصوصاً اُس علاقے کو منتخب کیا ہے جہاں حیدرآباد کے بعد مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست قائم تھی یعنی بھوپال۔

بھوپال کالی داس کی سرزمین ہے اور راجا بھوج سے لے کر سلطان جہاں بیگم اور نواب محمد حمیداللہ خاں کے دور تک یہاں علم و حکمت کا اتنا چرچا رہا ہے کہ اس علاقے کے بال بال میں آج بھی دانش و آگہی کے موتی پروئے ہوئے ہیں۔ ہر گھر میں علم ہے، ہر گھر میں کتابیں ہیں اور جہاں نہیں ہیں وہاں یقین ہے کہ ہوں گی ضرور، خود گھر والوں کو علم نہیں۔

بھوپال میں سب سے بڑا کتب خانہ "مولانا آزاد لائبریری" ہے جس کی بات ذرا تفصیل سے اور بعد میں کریں گے۔ پہلے آیئے بھوپال کے دوسرے کتب خانوں کی سیر کریں۔ شہر میں مولانا محوی صاحب کے پاس عربی اور فارسی کے قلمی نسخوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو انھوں نے بڑے جتن کر کے جمع کیا تھا لیکن مولانا صاحب کے آخری ایام میں لوگ ان سے جو کتابیں عاریتاً لے گئے تھے ان میں سے بیشتر کتابیں پھر کبھی واپس نہیں آئیں۔ اس پر مولانا محوی صاحب بہت مایوس

ہوئے اور وصیّت کر گئے کہ جو ذخیرہ بچ رہا ہے وہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ منتقل کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے مرحوم کی وصیّت پر عمل درآمد ہو گیا۔

بھوپال کے چند ایک قابلِ ذکر کتب خانوں کے متعلق وہاں اُردو کے محقق، نقّاد اور اُستاد جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے بتایا :

"یہاں نواب صاحب کی لائبریری میں دیوانِ غالبؔ کا نسخۂ بھوپال تھا جو وہاں سے لاپتہ ہو گیا ہے، معلوم نہیں کہاں گیا ہے، اُس لائبریری میں عربی اور فارسی کے بہت سے نسخے تھے لیکن ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں خود تلاش میں ہوں کہ وہاں سے کچھ چیزیں دستیاب ہو جائیں لیکن وہ یا تو کسی صندوق میں بند ہیں یا کسی ایسے کمرے میں بند ہیں جہاں کسی کی آمد و رفت نہیں ہے۔ خیال ہے کہ دیوانِ غالبؔ کا نسخۂ بھوپال بھی وہیں کہیں موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اسماعیل صاحب ہیں۔ بہت ضعیف ہیں۔ ان کا کتب خانہ بھوپال کتاب گھر مشہور رہا ہے۔ انھوں نے واقعی بہت محنت کی۔ اُردو سے عشق کیا۔ رسائل کا، قلمی نسخوں کا اور پرانی مطبوعات کا بہت اچھا ذخیرہ ان کے ہاں تھا۔ لیکن ان کی بیماری نے ان کے کتب خانے کو تقریباً ضائع کر دیا۔"

گوالیار میں حضرت محمد رضا غمگینؔ تھے۔ ان کے پاس غالبؔ کے خطوط تھے اور بہت سے قلمی نسخے تھے، خصوصاً فارسی کے۔ غمگینؔ مرحوم کا سارا ذخیرہ اب ان کے عزیزوں کے پاس ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ کس حال میں ہے۔

بھوپال کے اہلِ علم حضرات کا تذکرہ ہو تو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ انھوں نے اپنے دَور کے قریب قریب ہر علم پر کُل ملا کر دو سو سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ہی نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ان سے شادی کی تھی۔ کہتے ہیں کہ نواب صدیق حسن خاں کی ذاتی لائبریری بہت بڑی تھی، جس میں بہت سے ایسے قلمی

نسخے تھے کہ جن کی نقل کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کا خاندان بھوپال کے نور محل میں آباد ہے۔ ممکن ہے کہ علم کے بہت سے جواہر ابھی وہاں محفوظ ہوں۔

بھوپال اپنی داستان کے ایک کردار کو عرصے تک نہیں بھلا سکے گا اور وہ تھے ایم عرفان مرحوم، جن کے بارے میں خان شاکر علی خان نے کہا تھا کہ ایم عرفان جن ہے۔ انھیں علم اور اُردو دونوں سے غضب کا لگاؤ تھا اور ان دونوں کی خاطر رات دن کام کیا کرتے تھے۔ وہ شاہی محل کے فوٹوگرافر تھے اور کتابوں کے ایک بڑے ذخیرے کے مالک تھے۔ اب ان کے صاحبزادے ایم عمران صاحب اس کتب خانے کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

جہانگیرآباد میں رمزی ترمذی صاحب کا گھرانا بھی اہل علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگوں کے زمانے سے کتابوں کا ایک ذخیرہ چلا آتا ہے۔

بھوپال میں رام سہائے صاحب کا گھرانا بھی بڑا نامور ہے۔ رام سہائے صاحب بفضلہٖ ابھی زندہ ہیں اور نوّے ۹۰ سال سے اوپر ان کی عمر ہے۔ بھوپال کی تاریخ پر جیسی ان کی نگاہ ہے شاید ہی کسی کی ہو۔ ان کے پاس فارسی مخطوطے ہیں جن کا موضوع حسن و عشق نہیں بلکہ سائنس اور ریاضی ہے۔

اسی طرح قاضی وزیر الحسینی صاحب، صدرالدین صاحب اور حکیم قمرالحسن صاحب کے نام نامی بھی کہتے ہیں۔ ان بزرگوں نے قدیم کتابوں کو اولاد کی طرح بڑے چاؤ سے رکھا۔ حکیم قمرالحسن صاحب نامور طبیب تھے، ندیم کے ایڈیٹر تھے اور بہت اچھے انشا پرداز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں بہت سے مخطوطے ہیں جن میں علم طب کی کتابیں بھی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کے خالد عابدی صاحب نے مجھے بتایا کہ شمالی مدھیہ پردیش کے علاقے ریوا کی سنٹرل لائبریری میں کچھ فارسی مخطوطے ہیں جو غالباً تاریخ سے متعلق ہیں اور تحقیق کرنے والوں کی نگاہ سے ابھی تک چھپے ہوئے ہیں۔

والیانِ ریوا کے گھرانے میں جو کتابیں دیکھی گئی ہیں وہ غالباً اکبر اعظم کے زمانے سے چلی آرہی

ہیں۔ اُسی دَور میں وہاں مولوی رحمان علی خاں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اور انھوں نے تاریخ بندیل کھنڈ لکھی تھی جس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ کی یہ کتاب بیک وقت فارسی اور بگھیلی زبانوں میں لکھی گئی تھی۔ بگھیلی بہت حد تک اودھی سے ملتی جلتی ہے اور اس زبان میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں، لیکن مولوی رحمان علی خاں کی خود اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی یہ کتابیں ریوا میں موجود ہیں۔

اندور میں ایک قدیم لائبریری ہے جس کا سن تعمیر اور نام دونوں دلچسپ ہیں۔ یہ لائبریری ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئی تھی اور نام اس کا وکٹوریہ لائبریری ہے۔ یہ نام تو باقی نہیں رہے گا مگر خدا کرے وہ قدیم قلمی کتابیں محفوظ رہ جائیں جو ایک الماری میں بند پڑی ہیں۔

اسی طرح اُجین میں بھی ایک کتب خانہ ہے جو پنڈت پربھولال اشعر نے قائم کیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ وہاں بھی بہت سی قلمی کتابیں رکھی ہیں۔

البتہ مدھیہ پردیش کی ایک لائبریری ہے جسے ہندوستان کی تاریخ کے طالب علم فراموش اور نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔ یہ کتب خانہ سیتامئو میں ہے اور کہتے ہیں کہ مغل دَور کے روزناموں اور اخباروں کا وہاں ایسا ذخیرہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی اور خوش قسمتی سے اس ذخیرے کی دیکھ بھال بھی ہو رہی ہے۔

سیتامئو چھوٹا سا دور دراز مقام ہے جو ہندوستان کے نقشے پر مشکل ہی سے نظر آتا ہے لیکن جنھیں علم کی جستجو ہے وہ اُسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ چنانچہ تحقیق اور مطالعہ کرنے والوں کے رہنے سہنے کا سارا بندوبست بھی کتب خانے ہی میں ہے۔ میرے علم میں ایسا ایک اور اقامتی کتب خانہ سندھ کے مقام گڑھی یاسین میں ہے۔ سیتامئو کے اس کتب خانے کے بارے میں تاریخ کے استاد حامد جعفری صاحب نے بتایا:

"سیتامئو کی لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رگھو ویر سنگھ صاحب ہیں اور ان کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بڑے اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔ ان کی لائبریری میں مخطوطات اور ترجمے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان کے شوق کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے

مولوی اور منشی مقرر کیے ہیں اور مترجم مقرر کیے ہیں۔ خود بھی بہت اچھی فارسی جانتے ہیں۔ ان کے ہاں ترجمے کا کام مسلسل جاری ہے۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہے۔ انھوں نے عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ ترجمہ کرایا ہے جو اب شائع ہونے والا ہے۔ اُن کی لائبریری سے استفادہ کرنے والوں میں سر جادو ناتھ سرکار سے لے کر ڈاکٹر ایشوری پرشاد، بنارسی پرشاد، ڈاکٹر بینی پرشاد، غرضیکہ ہندوستان کا کوئی بڑا مورّخ ایسا نہیں کہ جس نے بیتامئو کے اس ذخیرے سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔"

یہ تو تھی ایک بڑے کتب خانے کی بات۔ بھوپال کے قریب ایک مقام ہے آشٹا۔ وہاں ایک صاحب ہیں جو پیشے کے لحاظ سے درزی ہیں۔ اُن کے پاس کتابوں کا پرانا ذخیرہ موجود ہے جس میں فارسی کی بہت سی کتابیں شامل ہیں۔ اسی طرح اسی پیشے کے ایک اور صاحب کی بات خالد عابدی صاحب نے بتائی:

"اندور میں ایک خیّاط ہیں۔ اُن کے پاس میں نے گیتا کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے جو بلامبالغہ ایک ہزار صفحوں پر ہے۔ اس کا رسم الخط فارسی لیکن اُس کی زبان اودھی ہے۔ وہ اُس کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔"

اندور ہی میں ایک اور صاحب ہیں، عبدالنور دانش۔ اُن کے پاس اکبر نامہ کا ایک بہت بڑا نسخہ موجود ہے۔ جنھوں نے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ کتاب کی لمبائی چوبیس انچ سے کم نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اکبر نامہ ابوالفضل کے بھائی نے نقل کیا تھا۔ اس پر طلائی کام ہے اور خود نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ عبدالنور دانش صاحب اُسے فروخت کرنا چاہتے ہیں اور اس کی قیمت چھ ہندسوں میں مانگتے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے کہ اکبر نامہ کا یہ نسخہ تیس سال میں مکمل ہوا تھا تو یہ قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔

کتابوں کا فروخت ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔ اس طرح کتابیں قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ان کی عمر بڑھ جایا کرتی ہے۔ لیکن افسوس اُس وقت ہوتا ہے جب کتابوں کے یہ قدرداں، کتاب بیچنے والے کی مجبوریوں اور پریشانیوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور جن جواہرات کا مول

لگانا مشکل ہے، وہ کوڑیوں کے مول خرید لے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں ایسے نیلام گھر اور ایسے ادارے نہیں جو کتاب کے مالک کو صحیح دام دلا سکیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک بات میں نے جگہ جگہ سنی اور بھوپال میں خالد عابدی صاحب نے بھی کہی:

"ایک صاحب ہیں۔ میں اُن کا نام تو نہیں لے سکتا کیونکہ وہ میرے ہم جماعت رہے ہیں۔ میں نے اُن کو دیکھا ہے۔ شاید وہ مفلسی کے عالم میں ہیں۔ وہ اکثر تھیلے کے اندر کچھ پُرانے مخطوطے ایک صاحب کو فروخت کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ سلسلہ جاری ہے۔"

یہ سلسلہ بھی جاری ہے اور مدھیہ پردیش کی سرزمین پر پھیلی ہوئی کتابوں کا تذکرہ بھی ابھی جاری ہے۔ آیندہ باب میں علم و دانش کے ان اونچے نیچے راستوں پر ہم اور آگے چلیں گے۔

آثار اچھے نہیں

ہم نے ایک الماری سے ٹین کا بنا ہوا، لمبا سا گول ڈبّا نکالا۔ زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر وہ ڈبّا جگہ جگہ سے پچک گیا تھا۔ اُسے کھولا تو اندر سے لپٹا ہوا وزنی کاغذ نکلا۔ گول تھان کی طرح لپٹے ہوئے کاغذ کو کھولنا شروع کیا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ کم سے کم اٹھارہ فٹ لمبا، دبیز اور مضبوط کاغذ تھا جس پر کسی خطّاط نے برسوں سر جھکا کر نہایت خوش خط قلم سے پھول بوٹوں اور قرآن کی آیتوں کے درمیان ایک شجرہ لکھا تھا جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہندوستان کے کسی رئیس پر ختم ہوتا تھا۔ پورا تھان کا تھان بالکل صحیح سلامت تھا مگر افسوس کہ آخری ایک انچ کا وہ ٹکڑا پھٹ کر ضائع ہو چکا تھا جس پر غریب خطّاط نے اپنے چھوٹے سے قلم سے باریک حروف میں خود اپنا نام اور کتابت کی تاریخ لکھی ہوگی۔ خوش خطی کا یہ شاہکار بھوپال کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔

ہمارا یہ باب بھی مدھیہ پردیش اور خصوصاً بھوپال کے لیے مخصوص ہے۔ شمالی ہندوستان کے ہنگاموں سے دُور وہ پُرسکون خطّہ جسے علامہ اقبال نے غور و فکر کے لیے سازگار پایا۔ بھوپال میں

اسی مناسبت سے علامہ اقبال لائبریری قائم ہوئی تھی اور اب تک موجود ہے۔ کتابوں کا ایک اور بڑا ذخیرہ خان باسط صاحب کے پاس ہے۔ وہ عبیدیہ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور غالباً نواب صدیق حسن خان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے گھر میں ایک بڑا کمرہ ہے جس میں پرانی کتابیں قرینے سے چُنی ہیں۔

قاری شفیق الحسن خاں صاحب پرانی کتابوں کے تاجر ہیں اور خود غالب کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دیوان کا وہ نسخہ بھوپال انھوں ہی نے دریافت کیا تھا جس کے ساتھ پھر غریب کی جورو والا معاملہ ہوا اور جس کی مٹی در بدر ہوئی۔ قاری صاحب کے پاس بھی نادر اور نایاب کتابیں موجود ہیں، مثلاً ایک کتاب کے بارے میں انھوں نے بتایا:

"اعجاز خسروی حضرت امیر خسرو کی فارسی تصنیف ہے۔ اگرچہ طبع ہو چکی ہے لیکن میرے پاس اُس کا جو نسخہ ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ حضرت امیر خسرو کے ہاتھ کا ہو کیونکہ ایک جگہ اس کے سنِ کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ سو کچھ ہجری میں لکھی گئی اور یہ سن حضرت امیر خسرو کی وفات سے پہلے کا ہے۔"

بھوپال میں گوبند پرشاد آفتاب کی شخصیت بھی نامی گرامی تھی۔ علاقہ بے نظیر کے قریب اُن کی رہائش گاہ تھی جس میں ان کا ذاتی کتب خانہ موجود ہے۔ گوبند پرشاد آفتاب صاحب نے خود بھی بہت سی کتابیں اُردو میں لکھی تھیں جن میں ڈراما اور ناول سے لے کر معدنیات کے علم اور زمین دوز پائپ بچھانے کے فن تک ہر موضوع شامل تھا۔ ان کتابوں کے قلمی نسخے ابھی تک موجود ہیں۔

اسی طرح بھوپال کے ایک اور محقق سلیم حامد صاحب تھے جن کے پاس بہت سی چھپی ہوئی اور ہاتھ سے لکھی ہوئی قدیم کتابیں موجود تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے کتب خانے پر آج کل قفل پڑا ہوا ہے۔

نواب صدیق حسن مرحوم کے خانوادے میں علی حسن مجیب صاحب موجود ہیں جن کے پاس

کئی ایسے نسخے محفوظ ہیں جن پر سونے کے پانی سے منقش حاشیے بنائے گئے ہیں اور جو خوش قسمتی سے اچھی حالت میں ہیں۔

بھوپال کے ایک اور گھرانے کے متعلق عربی کے استاد مسلم سلیم صاحب نے بتایا:

"یہاں ایک مفتی گھرانا ہے جس نے کافی کام کیا ہے اور اُس کے دو بڑے عالم گزر چکے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کے زمانے میں مولوی ذوالفقار احمد صاحب تھے جنھوں نے نواب صاحب کی فرمائش پر دس یا بارہ کتابیں لکھیں۔ دوسرے مفتی خلیل اللہ صاحب تھے جنھوں نے صَرف و نحو کے موضوع پر چار جلدوں میں محاسن الادب لکھی اور دو جلدوں میں لسان العرب لکھی۔ وہ خود خطاط تھے اور بڑی محنت سے کتابیں لکھتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے مخطوطے اچھی حالت میں موجود ہیں۔"

بھوپال کے محلّہ ہوا محل میں ایک نابینا طبیب حکیم مشفق محمد خاں صاحب رہتے ہیں۔ اُن کے پاس بھوپال کی تاریخ کا وہ نسخہ موجود ہے جو خود ریاست بھوپال کے بانی نواب دوست محمد خاں نے لکھا تھا۔ ایک اور کتب خانے کے بارے میں عربی کے اُستاد عقیل احمد صاحب نے بتایا:

"وکیل غیاث الدّین صاحب بھوپال میں تھے اور گوہر گنج میں وکالت کرتے تھے۔ اُن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی کتابوں کا ذخیرہ ایک کمرے میں بند پڑا ہے اور ان کے انتقال کے بعد غالباً وہ کمرہ کھلا ہی نہیں ہے۔ اب خدا جانے کتابوں کی کیا حالت ہوگی۔"

خالد عابدی صاحب، جن کا تعلق آکاش وانی اندور سے ہے، لکھنے پڑھنے اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں اور خود بھی قدیم کتابیں جمع کرتے ہیں۔ اُن کے پاس فقہ ہندی اور تذکرہ مراۃ الخیال کے قلمی نسخے ہیں اور شاعری پر کچھ رسالے ہیں جن میں مختلف اشکال سے فن عروض سمجھایا گیا ہے۔ کچھ کتابیں طب کے بارے میں ہیں اور گزشتہ صدی کی ایک فارسی شاعرہ کا تذکرہ ہے جو غالباً بھوپال میں رہتی تھیں۔

بھوپال میں قلمی نسخوں اور پرانی کتابوں کے دو بڑے ذخیرے دینی مدرسوں میں ہیں۔ ان میں سے ایک جامعہ اسلامیہ عربیہ ہے اور دوسرا دارالعلوم تاج المساجد ہے۔ تاج المساجد میں، جو برصغیر کی بڑی مسجدوں میں شمار ہوتی ہے، دو کتب خانے ہیں جن میں سے ایک طالب علموں کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا عام پڑھنے والوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ سیفیہ کالج اور حمیدیہ کالج میں بھی بعض بہت نادر کتابیں موجود ہیں۔

اور آخر میں ہم آتے ہیں بھوپال کی مولانا آزاد لائبریری کی طرف جو اتوارا روڈ پر ایک وسیع میدان کے درمیان بنی ہوئی ہے۔ یہ کتب خانہ ریاستی دَور کی شاندار سُرخ عمارت میں قائم ہے۔ گنبدوں، برجوں اور محرابوں کی اس عمارت کے بڑے حصّے میں تو آج کل جدید کتابیں رکھی گئی ہیں البتہ ایک بہت بڑے بغلی کمرے میں دیوار کے ساتھ ساتھ یورپین طرز کی شاندار اور بھاری بھرکم الماریاں کھڑی ہیں جن کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کتب خانے کے لیے ریاست حیدر آباد نے بطور خاص پیش کی تھیں۔ کسی زمانے میں یہ دیو قامت الماریاں قدیم کتابوں اور دستاویزوں سے بھری پڑی تھیں مگر اب ان کی حالت اُس بوڑھے کی ہے جس کے دانت جا بجا ٹوٹ گئے ہوں۔

جب یہ شاندار کتب خانہ قائم ہوا تو اس کا نام نواب محمد حمیداللہ خاں صاحب کے نام پر حمیدیہ لائبریری رکھا گیا۔ پھر وقت بدلا تو سنٹرل لائبریری کہلائی اور چونکہ وقت کا بدلنا کبھی رکتا نہیں، اب مولانا آزاد لائبریری کے نام سے بس اتنی ہی مشہور ہے کہ جب رکشہ والے سے کہا کہ مولانا آزاد لائبریری لے چلو تو وہ حیرت سے منہ تکنے لگا۔

یہ کتب خانہ بڑے چاؤ سے قائم ہوا ہوگا کیونکہ اِس میں والیان ریاست کے ذاتی ذخیروں سے نکال کر بے مثال نادر نسخے رکھے گئے۔ مثلاً نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی ایک کتاب میں جہاں دنیا بھر سے بیش قیمت کتابیں حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے وہیں ان کتابوں کا احوال بھی ہے جن پر انھیں ناز تھا۔ مثلاً صحیح بخاری کی ایک شرح جو تین جلدوں میں تھی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام کتابیں ابھی تک محل میں ہوں گی یا اِدھر اُدھر ہو گئی ہوں گی مگر میں نے محض آزمائش کی خاطر دیکھا

توضیح بخاری کی اُس شرح کو جو خطاطی کا بے مثال نمونہ ہے، وہیں مولانا آزاد لائبریری کے اسی بغلی کمرے میں پایا۔

لیکن گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ان کتابوں پر جو کچھ بیتی اُسے سن کر دل دکھتا ہے۔ اس کتب خانے میں فارسی کے تقریباً نو سو نسخے تھے، اب سات سو ہیں۔ عربی کی یہاں ساڑھے پانچ سو کتابیں تھیں، اب ساڑھے تین سو ہیں۔ اُردو کے ایک سو چون مخطوطے تھے، اب ایک سو تیس ہیں۔ تو پھر یہ چار سو کتابیں کیا ہوئیں؟ رجسٹر میں ان کے ناموں کے آگے لکھا ہے LOST/MISSING:

کسی نے کہا کہ یہاں محمود حسن صاحب اس کتب خانے کے نگراں ہوا کرتے تھے اور یہ نگرانی انھیں باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی۔ وقت سے پہلے ریٹائر کر دیئے گئے۔ انھیں علم ہوگا علم کی اس بے قدری کا۔ یہ سن کر میں محمود حسن صاحب کی تلاش میں نکلا۔ وہ ایک چھوٹی سی پرسکون مسجد میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ گمشدہ کتابیں کہاں گئیں؟ کہنے لگے:

''جاتیں کہاں؟ انھیں دیمک کھا گئی۔ بعض کتابیں اتنی خستہ ہوگئیں کہ ان لوگوں نے جلا دیں۔ میرے پاس ایک اخبار رکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ انھوں نے یہ کتابیں ۴۷ء میں جلائی ہیں۔''

قاری شفیق الحسن صاحب بھوپال کے پرانے باشندے ہیں اور اس کتب خانے کو اکثر دیکھتے رہے ہیں۔ مَیں نے ان سے کہا کہ مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں کچھ کہیے:

''مَیں نے ایک مرتبہ وہاں کی کتابوں کا سرسری طور سے جائزہ لیا تو بہت سے مخطوطے خراب حالت میں تھے اور بعض اچھی حالت میں بھی تھے۔ ویسے وہاں پر اب جو لائبریرین ہیں وہ حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں کہ یہ کتابیں محفوظ رہیں۔ اس سے پہلے وہاں کافی قلمی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ بعض دیمک کی نذر ہوگئیں۔ چنانچہ انھیں نذرِ آتش کر دیا گیا اور بعض کی حالت اتنی خراب ہوئی کہ انھیں ناقابلِ استعمال قرار دے کر جلا دیا گیا۔ اس کے باوجود وہاں موجودہ حالت میں کافی قلمی کتابیں موجود ہیں۔''

کچھ بچ گیا ہے، غنیمت ہے، مگر یہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ کوئی مداخلت کرے اور اس خزانے کو بچالے۔

مگر آثار اچھے نہیں اور بھوپال شہر میں اس عظیم الشان لائبریری اور اس کی شاندار عمارت کے متعلق کچھ اور ہی سننے میں آرہا ہے۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا:

"یہ بھی سنتے جلیئے کہ اس لائبریری کو اس عمارت سے ہٹایا جارہا ہے۔ اکثر و بیشتر سنا جاتا ہے کہ اب اس شاندار عمارت میں شاید پولیس کا دفتر یا ایسا ہی کوئی محکمہ قائم کیا جائے گا۔"

بیشک۔ سب کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔

بے خبری کا سلسلہ

میں رام پور کے بس اسٹینڈ پر اپنی بس سے اُترا تو فوراً ہی بہت سے سائیکل رکشا والے میری طرف لپکے۔ اُن میں سے جو شخص شکل و صورت سے ذہین اور سمجھ دار لگا، میں نے اس کا رکشا چُنا۔

"کہاں جائیں گے صاحب؟" اُس نے ایسے اعتماد سے پوچھا جیسے وہ رام پور کے چپّے چپّے سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔

میں نے اتنے ہی اعتماد سے جواب دیا" رضا لائبریری۔ رام پور رضا لائبریری۔"

اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا" وہ کہاں ہے صاحب؟"

یہ تو خیر رکشا والے کی بات تھی، وہ اگر مشرقی علوم کے، برصغیر کے سب سے بڑے کتب خانوں میں سے اِس ممتاز کتب خانے کو نہیں جانتا تو کوئی بڑی حیرت کی بات نہیں۔

مگر بے خبری کا یہ سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔

میں اودھ سے لیکر دکن تک اُردو، فارسی اور عربی کے بہت سے عالموں اور محققوں

سے ملا۔ اُن میں سے دو یا تین کے سوا کسی نے رام پور رضا لائبریری کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر لکھنؤ ہے جہاں دو نوجوانوں کو گزشتہ صدی کے اردو شاعروں پر تحقیق کرتے ہوئے پایا اور وہ آج تک رام پور نہیں گئے تھے۔

اور جب میں خود اس کتب خانے کی عمارت میں داخل ہُوا تو صرف ایک اسکالر کو مغل دور کی تصویروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے پایا۔ وہ ایک انگریز خاتون تھیں جو لندن سے چل کر رام پور پہنچی تھیں۔

اس عظیم الشان کتب خانے کا آغاز رام پور کے پہلے والیِ ریاست نوّاب فیض اللہ خاں کی ذاتی لائبریری سے ہوا۔ یہ دو سو سال پُرانی بات ہے۔ پھر مختلف نوّابوں کے دور آتے گئے اور سبھی علم کے اس خزانے میں اضافے کرتے گئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہُوا جس میں دلّی اور لکھنؤ دونوں ہی لُٹے۔ اُس وقت اہلِ کمال برہنہ سر، برہنہ پا بھاگے مگر چلتے چلتے گھر کی دو چار قیمتی کتابیں اور تصویریں سینے سے لگا کر لے گئے۔ ان دنوں غالبؔ کے شاگرد نواب یوسف علیخاں رام پور کے والی تھے۔ انہوں نے اہلِ کمال اور ان کے اثاثوں دونوں کی پذیرائی کی۔ اور پھر ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں کے دور تک رام پور میں کتابوں اور تصویروں کے اعلیٰ نمونوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ پھر آخری شاندار دور نواب رضا علی خاں کا تھا جو ۱۹۳۰ء میں حاکم ہوئے اور کہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں رام پور کی لائبریری کتابوں اور خصوصاً مخطوطوں سے پٹ گئی۔

اس کتب خانے کی خوش نصیبی تھی کہ اُن ہی دنوں مولانا امتیاز علی عرشی صاحب مرحوم اس کتب خانے کے ناظم مقرر ہوئے۔ علم سے اُن کو جو عشق، کتابوں سے لگاؤ اور تحقیق سے جو والہانہ محبت تھی وہ کس سے چھُپی ہے۔ عرشی صاحب نے اپنی باقی تمام زندگی اس کتب خانے میں گزار دی اور آج بھی کتب خانے کی عمارت کے سائے میں آنکھیں موندے سو رہے ہیں۔ بعد میں ان کی جگہ اُن کے بیٹے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے سنبھالی۔

اُس روز ملے تو بتانے لگے کہ اِس کتب خانے اور عرشی صاحب مرحوم کی خوش قسمتی تھی کہ

اُن کی ہر بات، ہر تجویز مانی جاتی تھی۔ جب کبھی انہوں نے نواب صاحب یا اس وقت کے وزیر اعلیٰ کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب کے سامنے کوئی تجویز رکھی، فوراً مان لی گئی۔ چنانچہ اکبر علی خاں عرشی زادہ کے بقول۔

"آج یہ لائبریری ہندوستان کی نہ صرف قدیم ترین لائبریری ہے۔ بلکہ اپنے ذخیرے کے اعتبار سے شاید سب سے زیادہ اہم لائبریری ہے۔ ہمارے پاس اس وقت پندرہ ہزار کے قریب مخطوطے ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد عربی کی ہے۔ یعنی تقریباً چھ ہزار مخطوطات۔ اتنے ہی لگ بھگ فارسی کے ہیں۔ تقریباً دو ہزار اردو کے ہیں اس کے علاوہ پشتو اور ترکی مخطوطات بھی ہیں۔"

اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو لوگ قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ، مسلم تہذیب اور دنیائے عرب کے دوسرے موضوعات پر تحقیق کرنا چاہیں انہیں رام پور تو جانا ہی پڑے گا۔ یا اگر آپ ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستان کے ادب پر کام کرنا چاہیں تو رضا لائبریری کا استعمال لازمی ہے۔ اپنے کتب خانے کی خوبیاں گنواتے ہوئے عرشی زادہ صاحب نے کہا۔

"ہماری لائبریری کو اگر آپ دیکھیں تو آپ کو نمایاں قسم کی کتابیں ملیں گی۔ مثلاً اردو کے قدیم شعراء: تو ہمارے ہاں تقریباً سارے ہی اہم تذکرے اُن کے محفوظ ہیں۔ بیشتر شعراء کے دواوین موجود ہیں جن کی وہ قدیم شکلیں ہیں۔ مثلاً میر تقی میرؔ پر کوئی شخص کام کرنا چاہے تو ہمارے ہاں بعض نسخے ایسے ہیں کہ ان سے کام لئے بغیر وہ میرؔ کی تدوین نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مصوری کی بات ہے۔ مغل مصوری کے سلسلے میں جتنا بڑا اور اہم ذخیرہ ہمارا ہے شاید بہت کم جگہوں پر ایسا ہوگا۔ اگر کوئی اکبر کے زمانے کی مصوری پر کام کرنا چاہے تو اس کے لئے یہاں آنا لازم ہو جاتا ہے، چاہے وہ مغل دور کا کوئی بھی موضوع ہو مثلاً نیچر اسٹڈی یا سماجی زندگی یا لباس۔"

اکبر ابھی جوان تھا جب ہندوستان کے مصوروں نے ایک مرقع بنایا جو مرقع طلسم کہلاتا

ہے۔ ویسے تو اُس کا موضوع ستارے اور بُرج ہیں جن کو مختلف حصّوں، مہینوں اور دنوں میں تقسیم کر کے بہت سی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ ان ستاروں کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، وہ تو ستارہ شناس جانیں مگر اس مرقع میں جو تصویریں ہیں انہیں دیکھا جائے تو اکبر کے عہد کے ہندستان کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ لوگوں کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، اٹھنا بیٹھنا، وہ سب کسی فلم کے مناظر کی طرح اس مرقع طلسم میں موجود ہیں اور وہ مرقع رام پور کے قلعے میں شاندار گنبدوں، بُرجیوں، محرابوں اور میناروں سے آراستہ اُس شاہی عمارت کے اندر محفوظ ہے جس میں کبھی خود نواب صاحب کا قیام تھا مگر جسے علم و ادب کی خاطر انہوں نے کتب خانے میں بدل دیا۔ آیئے کچھ اور کتابوں کا احوال عرشی زادہ صاحب کی زبانی سُنیں:

"ایسے ہی ہمارے ہاں ایک بہت اہم نسخہ قرآن مجید کا ہے جو ابن مقلیٰ بغدادی کے قلم کا لکھا ہوا ہے جن کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی، یعنی قرآن کا یہ نسخہ ایک ہزار برس سے بھی زیادہ پُرانا ہے۔ ابن مقلیٰ خط نسخ کا موجد ہے یعنی کوفی خط کو اس نے ذرا سہل بنایا، زیادہ خوبصورت بنایا اور اس طرح وہ خط پیدا ہوا جو آج کا نسخ بنا۔ اب عربی خط کی تاریخ پر کوئی شخص کام کرنے والا ہو تو اس کے لئے یہ نہایت اہم نسخہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم ہمارے ہاں قرآن مجید کا ایک اَور مخطوطہ ہے جو چمڑے پر لکھا گیا ہے۔ وہ پہلی صدی ہجری کا ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗہ کے دست مبارک کا نقل کیا ہوا ہے۔ کوفی خط میں ہے۔ خط کی تاریخ پر کام کرنے والا اس سے بھی صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔"

رام پور کے اس کتب خانے میں ایک اور قابلِ ذکر کتاب تاریخ محمدی ہے۔ یہ کتاب اورنگ زیب کے دور میں مرزا محمد حارث بدخشی نے مرتب کی تھی۔ اس کی ترتیب کی صورت یہ ہے کہ سن ایک ہجری سے سن گیارہ سو اکسٹھ ہجری تک سال بہ سال جو مشہور اور نامور لوگ انتقال کرتے رہے

اس سال کے خانے میں ان کی زندگی کے حالات درج ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ حالات جن جن کتابوں سے لئے گئے ہیں اُن کے حوالے بھی درج ہیں۔ مثلاً آپ مغل دور کے کسی اہم درباری کے حالات جاننا چاہتے ہوں تو آپ یہ "تاریخ محمدی" اٹھائیے اور اس میں اس کا سالِ وفات دیکھئے تو وہاں اُسکا نام بھی ملے گا، اس کے والد کا نام بھی ملے گا۔ دربار میں اس کا کیا منصب تھا۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا اور مرزا محمد حارث بدخشی نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں، یہ بھی مل جائے گا، رام پور کے کتب خانے میں اتفاق سے اس کتاب کی دوسری جلد ہے۔ پہلی جلد خدا معلوم کہاں ہے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ نے مزید بتایا۔

"اسی طریقے سے ہمارے ہاں ایک کتاب ہے جو ایک زمانے میں تو قدیم ترین تفسیروں میں شمار ہوتی تھی اور وہ ہے امام سفیان ثوری علیہ الرحمۃ کی تفسیر۔ اس کے ہمارے ہاں ۳۶ صفحے ہیں۔ ہماری لائبریری کی طرف سے اُسے شائع بھی کر دیا گیا ہے، بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ فقہائے شافعیہ کا ایک تذکرہ ہے جس کی دنیا میں ایک ہی کاپی ہے۔ اس کو بھی ہم سوچ رہے ہیں کہ شائع کر دیں"

رام پور کی رضا لائبریری اب تک اس قسم کی کئی نایاب کتابیں شائع کر چکی ہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور آئندہ کے لئے بھی بڑے منصوبے ہیں بشرطیکہ وسائل کا قحط نہ ہو۔

یہ تو ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا ذکر تھا۔ چھپی ہوئی کتابوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ وہ اتنی زیادہ ہیں کہ الماریوں میں شاید اب مزید گنجائش نہیں رہی۔ لیکن جیسا کہ عرشی زادہ صاحب نے مجھے بتایا، علم کے اتنے بڑے خزانے سے فیض اٹھانے کے لئے سال بھر میں وہاں صرف ساٹھ ستر محقق آتے ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ علم، تحقیق اور جستجو کا وہ دور گیا جب لوگ ضرورت پڑنے پر چین تک چلے جاتے تھے۔ یہ تن آسانی کا زمانہ ہے۔ لوگ دنیا زمانے کی ریسرچ اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھ کر کر لینا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ برصغیر میں عربی اور فارسی کا علم ختم ہوتا جارہا ہے جبکہ ان عظیم الشان کتب خانوں میں زیادہ تر قلمی نسخے عربی اور فارسی ہی میں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رام پور الگ تھلگ ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں باہر سے آنے والوں کے لئے وہ سہولتیں ناپید ہیں جو پٹنہ، حیدرآباد، دلّی یا لکھنؤ وغیرہ میں باآسانی دستیاب ہیں۔ رام پور میں ایک آدھ ہوٹل ہے اور وہ بھی معمولی، چنانچہ اب رضا لائبریری والے کوشش کر رہے ہیں کہ کتب خانے کے قریب ایک عمارت حاصل کرکے اس میں شایانِ شان مہمان خانہ قائم کر دیں جہاں اسکالروں اور محققوں کو قیام کرنے اور کام کرنے کی ساری سہولتیں حاصل ہوں۔

جو لوگ دور کہیں رہتے ہیں اور تھوڑی بہت تحقیق کے لئے اتنی دور کا سفر نہیں کر سکتے انہیں دنیا کے تمام بڑے کتب خانے کتابوں کی نقل فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کے صفحوں کی نقل اتارنے کے کام میں فوٹوگرافی نے بہت مدد دی ہے اور اب تو چند منٹوں میں پوری پوری کتاب کا عکس اتارا جا سکتا ہے۔ یہ فن REPROGRAPHY کہلاتا ہے۔ جن دنوں میں رام پور گیا، وہاں اس کا پورے طور پر انتظام نہیں تھا لیکن تیاریاں ہو رہی تھیں اور خیال تھا کہ سال بھر کے اندر اندر زیروکس کاپیاں اور مائیکرو فلم بنانے کے انتظامات پورے ہو جائیں گے۔

جن دنوں میں رضا لائبریری گیا، کتابوں کی نقل کے لئے مقامی باشندوں کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں جو عربی، فارسی اور اردو بخوبی جانتے ہیں اور خوشخط بھی ہیں۔ باہر کے شہروں سے نقل کی جو فرمائشیں آتی تھیں یہ لوگ ان کے مطابق کتابوں یا محض صفحوں کی ویسی ہی نقلیں اتار دیتے تھے جیسی کہ خود اصل ہے۔ عرشی صاحب مرحوم تو بعد میں اس اصل اور نقل کو ملا کر رکھ لیا کرتے تھے اور پورا اطمینان کرنے کے بعد محقق کو وہ نقل بھیجا کرتے تھے۔

ویسے لوگ اب کہاں رہے۔

رام پور کی رضا لائبریری سے یوں تو بے شمار ادیبوں، شاعروں، مورخوں اور محققوں نے فائدہ اٹھایا ہے لیکن اُن میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ ایک تو مولانا شبلی نعمانی صاحب جنہوں

نے رضا لائبریری میں بہت وقت گزارا اور دوسرے علامہ نجم الغنی خان رام پوری صاحب جنہوں نے تاریخ میں اپنی زیادہ تر تحقیق یہیں کی ہے۔ ان کے علاوہ رضا لائبریری کے بیش بہا ذخیرے سے موتی چن چن کرے جانے والوں میں مولانا عبدالماجد دریا بادی اور سید سلیمان ندوی جیسے بزرگوں کے نام نامی شامل ہیں۔

مگر پھر وہی بات کہ وہ لوگ گئے تو اُن کے ساتھ وہ دور بھی گیا۔ حیدر آباد دکن میں ایک شام ڈاکٹر گیان چند جین صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ اردو سے انہیں والہانہ لگاؤ ہے اور تحقیق کی خاطر اتنے بہت سے پرانے اور تاریک کتب خانے جھانک چکے ہیں کہ بینائی پر بن آئی ہے۔ رضا لائبریری کے بارے میں انہوں نے بہت دلچسپ بات بتائی۔ اس باب کو ہم ان ہی کی بات پر ختم کرتے ہیں۔

"رام پور کے کتب خانے میں ایک عجیب و غریب چیز داستانیں ہیں۔ وہاں کے درباری داستان گویوں نے طلسم ہوش رُبا اور داستانِ امیر حمزہ کے انداز میں داستانیں تصنیف کیں اور وہ ان ہی کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک سو پانچ جلدیں موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ ایک ایک کاپی ہے اس کی اَور نقل نہیں۔ اور ہر جلد ہزار سوا ہزار صفحے کی ہوگی۔ بہت بڑے سائز کی۔ جہاں تک ان کی زبانوں اور اسلوب کا تعلق ہے تو میری رائے میں وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فسانۂ عجائب یا مطبوعہ طلسم ہوش ربا کا۔ معلوم نہیں اُن میں کیا کیا گوہر بند ہوں گے۔ کوئی اُن کی سیر کرے تو معلوم ہو۔ میں نے ان کو الٹ پلٹ کے دیکھا ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ کوئی توقع نہیں کہ وہ کبھی شائع ہو سکیں گی۔ اور یہی بدقسمتی ہے کہ ہم ایسی زبان کے امین ہیں کہ جس میں اتنے ذخیرے ہیں اور جس کا خزانہ اتنا بیش بہا ہے لیکن ہمارے وسائل اتنے محدود ہیں کہ ہم ان کو محفوظ بھی نہیں کر سکتے۔"

انہیں خدا بخشے

جب کبھی کہیں اجاڑ موسم آتا ہے تو پرندے وہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔

کچھ یہی حال کتابوں کا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب تاتاریوں نے بغداد کو لوٹا تو وہاں کی کتابیں ٹونک تک پہنچیں اور جب عیسائیوں نے قرطبہ پر دھاوا بولا تو وہاں کی کتابیں پٹنہ تک گئیں۔

ہمارا یہ باب پٹنہ کے لئے مخصوص ہے۔

ایک صاحب تھے، خدا بخش۔ علم و ادب پر اُن کے اتنے احسانات ہیں کہ دل سے ان کیلئے یہی صدا نکلتی ہے کہ خدا بخشے۔ ان کے والد جب انتقال کرنے لگے تو ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک ہزار چار سو کتابیں بیٹے کے حوالے کر گئے اور کہہ گئے کہ جوں ہی حالات اجازت دیں، ان کتابوں کو عوام کے لئے کھول دینا۔

خدا ایسی کتابیں اور ایسے بیٹے سب کو دے۔ خدا بخش علم کے اس خزانے میں نئے نئے جواہر بھرتے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس چار ہزار مخطوطے جمع ہو گئے۔ اب یہ کھیتی پک کر تیار

تھی۔ بیٹے نے باپ کا خواب پورا کر دکھایا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو یہ کتب خانہ وقف قرار پایا اور کتب خانے کا نام رکھا گیا ”اورینٹل پبلک لائبریری“۔ اس کے نام میں نہ کسی شخصیت کا نام شامل تھا نہ کسی کاروباری ادارے کا۔

مگر اُس زمانے میں عوام طے کیا کرتے تھے کہ ان کا محسن کون ہے۔ چنانچہ لوگ نہ مانے انہوں نے اورینٹل پبلک لائبریری کو اوّل دن سے خدا بخش لائبریری کہا اور بانکی پور کے بارونق علاقے میں وہ آج بھی خدا بخش لائبریری کے نام سے ماضی کی عظمتوں کا مینارہ بنی کھڑی ہے اور اس کی کرنیں کہاں کہاں نہیں بکھری ہیں۔

پہلے پہل اس کا تعارف پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یوں کرایا۔

”اس وقت کتب خانہ جو سب سے اچھا کام کر رہا ہے وہ ہے خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ۔ جس کے ڈائرکٹر ہیں عابد رضا بیدار صاحب۔ بڑی محنت سے، بڑے سلیقے سے، بڑی کوشش سے، بڑی لگن سے انہوں نے اہتمام کرایا ہے۔ پرانی چیزوں میں سے بعض بعض چیزوں کو چھاپ بھی رہے ہیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ وہ خاص مشاہیر کو بلا کر ان کے توسیعی خطبات بھی کراتے ہیں اور خدا بخش جرنل کا بھی انہوں نے اجرا کیا ہے۔ جو بھی ملکی یا غیر ملکی اسکالر ہندوستان سے، پاکستان سے، مغرب کے یورپی ملکوں سے یا امریکہ سے یا روس سے وہاں پہنچتا ہے، اس کی وہ ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔“

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں کتابیں اور خوبیاں دونوں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ یہ بنیادی طور پر مخطوطات کی لائبریری ہے۔ خصوصاً عربی اور فارسی کتابوں کا یہاں بے مثال ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانے میں اُردو، فارسی اور عربی کے پندرہ ہزار قلمی نسخے ہیں جن میں سے ابھی صرف آدھے نسخوں کی فہرستیں چھپی ہیں اور وہ دو چار نہیں۔ چونتیس ۳۴ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اشاعت کا یہ کام ابھی جاری ہے۔ اور نہ معلوم کتنے عرصے جاری رہے گا۔

لیکن خدا بخش کے والد نے تو انہیں صرف ۱۴ سو کتابیں سونپی تھیں، پھر یہ پندرہ ہزار

کیسے ہوگئیں ؟ یہی سوال میں نے لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار سے کیا۔ کہنے لگے۔

"یہ تو کچھ ایسا ہے کہ آدمی کو کسی بھی چیز کی لگن ہو۔ پیاس چاہیئے انسان کو۔ شدت کی پیاس ہو تو شاید کنواں بھی پیاسے کے پاس آجائے۔ یہ مثال کم سے کم ہمارے لئے تو سچ ثابت ہوئی کہ خدا بخش کے پاس کتابیں کھنچ کر آتی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی کیا کہ ایک عرب کو ملازم رکھا جسے اُس زمانے میں وہ پچاس روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پچاس روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ شخص ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتا تھا اور اطلاعیں دیتا تھا کہ فلاں جگہ کتابوں کا ذخیرہ ہے، آپ خود خط و کتابت کر لیجئے، یہ اطلاع ہے۔ تو اس طرح مصر، حجاز، ایران و عراق سے کتابیں ان کو ملتی تھیں، ہندوستان بھر سے کتابیں ملتی تھیں۔ اُن کی کتابیں ایک بار چوری ہوگئیں۔ کتاب فروش کے ہاں پہنچیں۔ اس نے ان کو اطلاع دی کہ ہمارے پاس کچھ کتابیں بکنے آئی ہیں۔ آپ خریدیں گے؟ اس طرح وہ کتابیں پھر ان کے ہاں پہنچ گئیں، اگرچہ قیمتاً پہنچیں۔"

خدا بخش لائبریری کی دوسری بڑی خصوصیت مغل عہد کی پینٹنگز ہیں اور خصوصاً فارسی کی وہ قلمی کتابیں ہیں جن میں مصوروں نے اپنے شاہکار بنائے ہیں۔

پٹنہ کے اس کتب خانے کی ایک اور خصوصیت اردو کے پرانے رسالے اور جریدے ہیں۔ ان کا جتنا بڑا ذخیرہ یہاں ہے، دوسری جگہ شاید ہی ملے۔ خدا بخش لائبریری میں گزرے وقتوں کے تقریباً ایک ہزار مختلف اردو رسالوں کے کئی لاکھ شمارے محفوظ ہیں۔ مگر یہ ایسا بیکراں سمندر تھا کہ اس میں اگر آپ کسی خاص عنوان کی تلاش کرتے تو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا لائبریری نے ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کے فہرست وار کارڈ بنانے شروع کئے ہیں اور اب تک دو لاکھ سے زیادہ اشاریاتی کارڈ تیار کر لئے ہیں اور ابھی تو بہت کام ہونا باقی ہے۔

ان لاکھوں کارڈوں کی تیاری میں خدا بخش لائبریری نے ایک دلچسپ اور کامیاب تجربہ کیا، یعنی اس کام میں طالب علموں کو بھی شریک کرلیا اور انہیں پانچ پیسے فی کارڈ کے حساب سے معاوضے کی پیش کش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم دن میں دو تین گھنٹے کام کرکے پانچ سے سات روپے تک کما لیتا تھا جس سے اس کا اپنا خرچ اور تعلیم کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس تجربے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سینکڑوں طالب علموں میں چار پانچ سال کے اس کام کے دوران کتب خانے کا ذوق پیدا ہوا اور اب وہ باقاعدگی سے لائبریری کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خدا بخش لائبریری کی کچھ اور خصوصیات عابد رضا بیدار صاحب نے بیان کیں:

" ہم دوسری جگہوں سے اہم مخطوطات کے مائیکروفلم حاصل کر رہے ہیں۔ کتب خانوں سے بھی اور ایسی جگہوں سے بھی جہاں برباد ہونے کے خطرے زیادہ ہیں، مثلاً خانقاہوں وغیرہ میں۔ ایک آدھ جگہ ایسی بھی ہے جہاں اصل مخطوطے تلف ہو چکے ہیں، صرف ان کے عکس ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

ایک شعبہ ہم نے ابھی حال ہی میں کیسٹ اور ٹیپ کا قائم کیا ہے۔ جو اہم لوگ ہیں ان کی آوازیں صدابندی کے بعد یہاں محفوظ کرلی جاتی ہیں۔ ایک اور چیز جو شروع کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مصنفوں سے اُن کے مسودے لے لئے جائیں جو چھپنے کے بعد عموماً پھینک دیئے جاتے ہیں۔ وہ بھی آئندہ ریسرچ کا موضوع بن سکیں گے"

ایک اور شعبہ جو اب شروع ہو رہا ہے وہ "معاصر اسلام" یا CONTEMPORARY ISLAM کہلائے گا۔ مستقبل کا مورخ جب آج کے اسلام کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس دور کی دستاویزوں کو خدا بخش لائبریری میں اپنا منتظر پائے گا۔ اس نئے شعبے میں عالم اسلام کی وہ تمام دستاویزیں جمع ہوں گی جن کا تعلق دین سے ہے۔

دستاویزوں کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی سُن لیجئے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی

اردو دستاویزوں کا بڑا ذخیرہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ تحریکِ آزادی کے دور میں قلم کے محاذ پر جتنی جنگ اردو زبان میں لڑی گئی اُس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لئے اُس وقت کے بڑے بڑے رہنما اُردو میں لکھتے تھے چنانچہ خدا بخش لائبریری کے شیلف تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو اور لاجپت رائے جیسے صفِ اوّل کے رہنماؤں کی اردو تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال مسلم رہنماؤں کی تحریروں کا ہے۔ بیدار صاحب نے اچھی بات کہی کہ ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ساری دولت صرف افسانے یا شعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی سنجیدہ موضوعات پر بھی لوگ دل جما کر لکھتے تھے۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب چکبست کا رسالہ صبح امید، پیارے لال شاکر کا العصر، نوبت رائے کا ادیب اور دیا نرائن نگم کا رسالہ زمانہ شائع ہوا کرتے تھے۔ خدا بخش لائبریری اپنے جرنل میں ان رسالوں کا انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں، مثال کے طور پر منشی پریم چند کی بہت سی ایسی کہانیاں موجود ہیں جو ان کے مجموعوں میں نہیں آئیں۔ سائنس پر بھی بہت سے مضامین ہیں جبکہ اردو والے بھول گئے کہ سائنس میں کبھی ایسا لٹریچر بھی پیدا ہوا تھا۔

خدا بخش لائبریری ایک اَور بڑا کام یہ کر رہی ہے کہ نادر اور قابلِ ذکر قلمی نسخوں کو جدید کتابوں کی شکل میں چھاپ رہی ہے تاکہ علم کی اس بند سیپ سے نکل کر یہ موتی عام لوگوں کے گھروں کو بھی منور کر سکیں۔

ایسے ہی ایک مخطوطے کا ذکر عابد رضا بیدار صاحب نے کیا۔

"یہاں دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ ہے۔ ہمایوں کو جب ایران میں پناہ لینا پڑی تو وہ وہاں سے ایک نسخہ لایا، وہ نسخہ پھر دارا شکوہ تک چلتا رہا۔ دارا نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں ایک نسخہ چلا آ رہا ہے جس سے ہمارے باپ دادا فال نکالا کرتے تھے۔ اس کے حاشیوں پر فال کا اندراج موجود ہے۔ مثلاً ہمایوں اور جہانگیر کی نکالی ہوئی فال۔ اور مجھے شبہ ہے کہ ایک جگہ شاہ جہاں کی نکالی ہوئی

فال کا اندراج موجود ہے۔ وہ ہم جوں کا توں آفسٹ پر چھاپ رہے ہیں تاکہ ان کا اصل خط عوام کے سامنے آجائے۔"

مُعبد، مغلوں کے آخری عہد کا بہت بڑا دانشور تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے دبستان مذاہب لکھی تھی جس کا بعد میں سارے مغرب نے SCHOOLS OF RELIGION کے نام سے مطالعہ کیا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مُعبد شاعر بھی تھا اور صاحبِ دیوان تھا۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ تھا جو خدا بخش لائبریری میں نکل آیا۔ اس دیوان کی روشنی میں وہ اور بڑا دانشور نظر آتا ہے۔ یہ دیوان بھی چھاپا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بیدار صاحب نے بتایا:

"ہم نے عہدِ شاہ عالم کی ایک محاورات کی لغت چھاپی ہے جنہیں آپ ہندی یا اردو دونوں محاورات کہہ سکتے ہیں، اُس عہد میں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اس سے قبل کی ایک لغت چھاپ رہے ہیں جو اورنگ زیب کے پوتے کے لئے لکھی گئی۔ اورنگزیب نے اپنے پوتے کے لئے اتالیق مقرر کیا تھا۔ اس نے علوم ہند یہ پر ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی اُس میں سے ہم نے لغت کا حصہ نکال لیا ہے جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں چھاپا جا رہا ہے کیونکہ وہ ہندی کی بھی ایسی ہی لُغت ہے جیسے اُردو کی۔ ایسے ہی ایک منصوبہ ہے "تاریخِ خاندانِ تیموریہ" چھاپنے کا جو مغل مصوّری کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے اور اس کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مصوّری کا تاج محل ہے۔"

علومِ مشرقی کے اِس کتب خانے نے جو شاندار روایات قائم کی ہیں اُن کا اسے صِلہ بھی خوب ملا اور نہ جانے کتنے بزرگ وصیت کر گئے کہ ان کی کتابوں کے ذخیرے خدا بخش لائبریری کو دے دیئے جائیں، یا پھر ان کے پسماندگان نے ان کے ذخیرے اس کتب خانے کو پہنچا دیئے اور ظاہر ہے کہ اس کام کا ثواب کہاں کہاں تک پہنچا ہو گا۔ آرہ کے ڈاکٹر رشید الدین احمد مرحوم، پٹنہ کے ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم اور سابق وزیرِ تعلیم سر فخر الدین مرحوم کی کتابوں کے ذخیرے اس کتب خانے کو مل گئے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی چھ سات ہزار تحقیقی کتابیں اس لائبریری کو دے دیں۔ کچھوہ میں دیوان ناصر علی صاحب کا ذخیرہ تھا جسے سخت نقصان پہنچا۔ مگر جو کتابیں اور مخطوطے بچ گئے وہ خدا بخش لائبریری نے حاصل کر لئے۔ ان میں دیوانِ ہمایوں کا نسخہ بھی شامل ہے حکیم علیم الدین بلخی صاحب نے اپنے والد کی کتابیں اس کتب خانے کو دے دیں جن میں مکتوباتِ صدی جیسی قیمتی کتاب شامل ہے جس پر مظفر شمس بلخی کی اپنی تحریریں حاشیوں پر NOTES لکھے گئے ہیں۔

ایک اور عظیم الشان کتب خانہ جو خدا بخش لائبریری میں منتقل ہوا اس کا احوال بھوپال میں اردو کے محقق اور استاد عبدالقوی دسنوی صاحب نے سنایا:

" پٹنہ سے تیس میل دور ایک گاؤں دسنہ ہے جہاں کے علامہ سلیمان ندوی ہیں۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ وہاں ایک بڑا عظیم کتب خانہ تھا۔ الاصلاح لائبریری؛ اس میں بہت سے قلمی نسخے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے اور ویرانی بڑھنے لگی تو ہم سب کو احساس ہوا کہ اس لائبریری کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار تھے اُن سے ہم لوگوں نے رجوع کیا۔ اُن تک پہنچے اور ان سے کہا کہ کسی طرح اس کتب خانے کو بچائیے کہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں تو ذاکر صاحب نے بہت دلچسپی لی اور سارے کتب خانے کا بہت اچھا حصّہ خدا بخش لائبریری منتقل کر دیا۔ یہ سب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ پہلا گاؤں دسنہ ہے جس نے اتنی بڑی قربانی دی، صرف اس لئے کہ آئندہ کام کرنے والوں کے لئے یہ مفید طور سے استعمال ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ تحقیق کر سکیں۔"

تو یہ ہے ایک جیتے جاگتے پھلتے پھولتے کتب خانے کا احوال۔ اس کی موجودہ عمارت اب بڑھا کر دگنی کی جا رہی ہے۔ اس میں ائرکنڈیشنڈ کمرے ہوں گے جن میں قلمی کتابیں محفوظ رہیں گی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، بہت بڑے عملے کو مصروف پایا، کہیں تحقیق ہو رہی تھی۔ کہیں اشارتی

کارڈ بن رہے تھے۔ کہیں زیروکس کاپیاں اور مائیکرو فلمیں بنائی جا رہی تھیں اور کہیں خوشنویس بیٹھے پُرانی دستاویزوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔ ایک شعبے میں جلد بندی ہو رہی تھی، ایک گوشے میں ناقص کاغذوں کو موسم کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لئے کیمیاوی عمل جاری تھا۔ خلیج کے علاقے سے ایک بزرگ تشریف لائے تھے جو زکوٰۃ پر اتھارٹی ہیں، وہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کتب خانہ قارئین سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف زندگی کے آثار اور ہر سمت چہل پہل تھی۔

یہ تو تھی زمین کی صورتِ حال، آسمانوں تک میری نگاہ تو نہیں پہنچی مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کہیں خدا بخش کی روح بے حد مسرور ہو گی۔

خدا کے ہاں ایسے ہی لوگوں کی بخشش ہوتی ہے، مجھے یقین ہے!!

چھ ہزار سنگ میل

میں جن دنوں راجستھان پہنچا، سرکاری ملازموں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ صوبائی حکومت کے کام بند پڑے تھے اور سرکاری اجلاس، کانفرنسیں، نمائشیں اور دوسری مصروفیات معطل تھیں کیونکہ ملازمانِ سرکار ڈیوٹی پر آنے اور تعاون کرنے سے صاف انکار کر رہے تھے۔

اتفاق سے اُن ہی دنوں ٹونک میں علوم شرقیہ کے ایک تحقیقی ادارے نے تصوّف کے موضوع پر ایک کُل ہند مذاکرے کا اہتمام کیا تھا۔ ملک بھر سے علماء اور اساتذہ ٹونک پہنچ رہے تھے مگر انہیں خبر نہ تھی کہ جس اجلاس کے لئے وہ مہینوں مطالعہ اور تحقیق کر کے آئے ہیں اس کا منعقد ہونا اب ممکن نہیں۔

اجلاس کے منتظمین سر پکڑے بیٹھے تھے کیونکہ سارا سرکاری عملہ ہڑتالیوں کے کیمپ میں جا چکا تھا اور ٹریڈ یونین کے رہنماؤں نے اعلان کر رکھا تھا کہ حکومت کی پوری مشینری اب جام رہے گی؛ کہ اچانک ہڑتالیوں کے لیڈر آن پہنچے اور اجلاس کے منتظمین سے کہا کہ آپ کا مذاکرہ ہماری لگائی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہے۔ آپ کا ادارہ خالص علمی ادارہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہماری

ہڑتال کی وجہ سے علم کے اس ستھرے دامن پر کوئی داغ آئے۔

اگلے ہی لمحے سارا ہڑتالی عملہ کام پر واپس آگیا۔ تصوّف کے حوالے سے خوب خوب مباحثے ہوئے۔ مقالے پڑھے گئے اور علم کا علم سے لین دین ہُوا۔ پورے راجستھان کا سرکاری پہیہ جام تھا مگر ٹونک کے " ادارۂ تحقیق عربی و فارسی "، میں کام حسبِ معمول جاری تھا۔

مجھے کسی نے غلط تاریخ بتادی۔ میں جس روز ٹونک پہنچا، مذاکرہ اُس سے ایک دن پہلے ختم ہوچکا تھا۔ دریاں اٹھائی جارہی تھیں۔ کرسیاں تلے اوپر چُن دی گئی تھیں۔ اور مہمان جاچکے تھے۔ میں سمجھا کہ میرا آنا بیکار گیا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ قسمت مجھے ہندوستان کے ایسے گوشے میں لے آئی ہے کہ جہاں سارے جہان کا علم جمع ہے۔

ٹونک ایک چھوٹا سا، غریب سا دور دراز شہر ہے جہاں ریل گاڑی بھی نہیں جاتی میں ایک کار میں بیٹھ کر جے پور سے ٹونک پہنچا تھا۔ اس روز شہر میں بس وہی ایک کار نظر آئی۔ پُرانی آبادی سے گزر کر، سیدھی لکیر جیسے ایک کشادہ بازار میں دو رویہ رنگریزوں کو چنریاں رنگتے اور لکڑی کے ٹھپّوں سے گل بوٹے چھاپتے دیکھتا ہوا میں ایک فصیل کے قریب پہنچا۔ ہماری کار ایک شاہانہ در میں داخل ہوئی اور ویسی ہی ایک شاہانہ عمارت کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس پر لکھا تھا:" عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ "۔

میں سارے ہندوستان میں یہی بات سُنتا آرہا تھا کہ عربی فارسی کا ذوق اب ختم ہوا - ان زبانوں کو سمجھنے والے بھی ختم ہورہے ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ برِّصغیر کا بیشتر تاریخی ریکارڈ یا تو فارسی میں ہے یا عربی میں۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ تاریخ کے اس ورثے سے اب کسی کو دلچسپی نہیں۔ ایسی حوصلہ شکن باتیں سننے کے بعد راجستھان کے ویرانوں کے بیچ عربی اور فارسی کا چشمہ اُبلتا دیکھا تو وہی راحت محسوس ہوئی جو طویل مسافت کے بعد کسی نخلستان میں پہنچ کر ہوتی ہے۔

میں تو تصوف کے سیمینار میں آیا تھا لیکن اُس روز خود کو چھ ہزار ایسی کتابوں کے درمیان پایا جنہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی علم کی شاہراہ کے چھ ہزار سنگ میل اکھاڑ کر یہاں نذر باغ کی چبوترے والی کوٹھی میں لے آیا ہو۔

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کی طرح یہ بھی بنیادی طور پر قلمی کتابوں کا ذخیرہ ہے - اور کتابیں بھی ایسی کہ جو شہنشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے کتب خانوں میں رہ چکی ہیں - کوئی کتاب ہرات سے پہنچی ہے، اُس پر جامیؔ کی تحریر موجود ہے۔ کوئی کتاب لُٹے ہو بغداد سے آئی ہے اُس پر دجلہ کے چھینٹے موجود ہیں۔ کسی پر شاہ جہاں کے دستخط ہیں، کسی پر اس کے بیٹے داراشکوہ کی تحریریں ہیں۔ کہیں بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں نے چند کلمات لکھے ہیں تو کہیں شاہ ولی اللہؒ کی تحریر آنکھوں کے راستے روح میں اتر جاتی ہے۔

اس دور میں ایسے کتب خانے بہت کم ہوں گے جو بیک وقت علم کی آماجگاہ بھی ہوں اور زیارت گاہ بھی۔

راجستھان میں بائیس ریاستیں تھیں جن میں ٹونک واحد مسلم ریاست تھی ۱۸۵۷ء میں دلّی اور لکھنؤ اجڑے تو کتنے ہی خاندان برباد ہوئے۔ اہلِ علم پناہ کی تلاش میں ٹونک پہنچے۔ روہیلے سردار امیر خان کی یہ ریاست دیکھتے دیکھتے علم و حکمت کا گہوارہ بن گئی۔ درس و تدریس کا سلسلہ چلا، جابجا مدرسے کھُلے، ہر گھر میں کُتب خانے قائم ہوئے۔ تصنیف و تالیف کا زور ہوا، اور وسطی ایشیا، ایران، افغانستان، مصر اور خود ہندوستان سے کتابیں کھنچ کھنچ کر ٹونک پہنچنے لگیں۔

سوا سو سال ہونے کو آرہے ہیں جب نواب محمد علی خاں اس ریاست کی مسند پر بیٹھے اور اس کتب خانے کی بُنیاد ڈالی جس کا یہ تذکرہ ہے۔ انگریزوں نے انہیں معزول کر کے بنارس بھیجا تو وہ اپنا کتب خانہ ہمراہ لے گئے اور خطا اور سزا سب کو بھُول بھال کر وہ ایک عظیم الشان لائبریری بنانے میں مصروف ہوگئے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو فرش پر چُنی جانے والی کتابیں چھتوں کو چھو رہی تھیں۔

نواب محمد علی کے صاحبزادے اس شاندار خزانے کو منتقل کر کے ٹونک لے آئے اور جب تک ریاست خوش حال رہی کتب خانے میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج اس میں تیس علوم پر تقریباً پندرہ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں جو چھ ہزار جلدوں میں بندھی ہوئی ہیں۔ ان علوم میں تفسیر، حدیث، فقہ،

سیرت، فلسفہ، ادبیات، فلکیات، نجوم، طب، ریاضی، تاریخ اور تنقید پر دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔

لیکن عربی فارسی مخطوطوں کے اس ذخیرے کو یوں بچا بچا کر رکھنے اور فروغ دینے کے اس کارنامے میں کون کارفرما ہے؟ وہ ہے راجستھان کی حکومت اور صاحبزادہ شوکت علیخاں کی شخصیت۔

ٹونک کی دکانوں کے اوپر ایک کمرے میں بند یہ سعیدیہ لائبریری اُن ہی کی کوششوں سے ندر باغ کے شاہی محل کی عمارت میں منتقل ہوئی اور اُن ہی کی جدوجہد سے حکومت راجستھان کا ڈائرکیٹریٹ قرار پائی جس میں وہ خود ڈائرکیٹر ہیں۔ آیئے اُن کی داستان انہی کی زبانی سُنیں۔

"۱۹۶۱ء میں جب میں نے اس کتب خانے کا چارج لیا اس وقت نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ چونکہ ٹونک علمی گہوارہ رہا ہے، اگر تمام راجستھان میں بکھرے ہوئے مخطوطوں کو ٹونک میں لے آیا جائے اور سرکاری کتب خانے میں جو مخطوطے کسمپرسی کی حالت میں ہیں اُن کو یہاں منتقل کر دیا جائے تو یہ راجستھان کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ مجھے فخر بھی ہے اور احساس تشکر بھی کہ میرے اس ادارے کو کامیاب بنانے میں یہاں کے علماء، فضلاء اور مشائخ نے میرا ساتھ دیا۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت راجستھان نے فیصلہ کیا کہ عربی فارسی کے بکھرے ہوئے مخطوطے ٹونک میں جمع کر دیئے جائیں۔ چنانچہ کئی مقامات مثلاً بھرت پور، جھالاواڑ اور اودے پور کے کتب خانوں میں جا کر میں خود وہاں کے جواہر پاروں کو اپنے اس دامن میں سمیٹ لایا۔"

صاحبزادہ شوکت علی خاں کی اس داستان کے بعد آیئے اب اس عظیم الشان کتب خانے کی چند قابلِ ذکر کتابوں پر نگاہ ڈالیں۔

یہاں تیس ورق کا ایک قرآن مجید قابلِ دید ہے۔ اس میں ہر ورق پر ایک ایک پارہ باریک قلم سے لیکن اس خوبی سے لکھا گیا ہے کہ اس کے روشن حروف دور سے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ پھر اس قرآن کے الفاظ اس طرح بٹھائے گئے ہیں کہ پارے کی ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ ہر صفحے پر سونے کا کام ہے، مینا کاری کی گئی ہے۔ اور دلکش بیلوں سے حاشئے بنائے گئے ہیں۔ یہ قرآن مجید شاہجہاں کے زمانے میں عبدالباقی نے لکھ کر بادشاہ کو پیش کیا تھا اور شاہجہاں نے خوش ہو کر عبدالباقی کو نہ صرف یاقوت رقم کا خطاب دیا بلکہ انہیں سکوں میں تلوا کر وہ سارے سکّے عبدالباقی کو دے دیئے تھے۔

ٹونک میں قرآن مجید کا ایک اور نسخہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو ادھورا رہ گیا ہے، اور کسی کو علم نہیں کہ بادشاہ اسے مکمل کیوں نہ کر سکا۔

تفسیر کی کتاب 'زادالمسیر' قابلِ ذکر ہے۔ خیال ہے کہ یہ کتاب خلفاء عباسیہ کے کتب خانوں میں رہ چکی ہے۔ سن ۱۲۰۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا اور وہاں مامون رشید کے کتب خانے پر حملہ کر کے اس کی دس لاکھ کتابیں دریا میں پھینک دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو کی فوجوں نے ان ہی کتابوں کے اوپر چل کر دجلہ پار کیا تھا اور کتابوں کی سیاہی گھلنے سے دجلہ کا پانی سات دن تک سیاہ رہا تھا۔ 'زادالمسیرہ' کے اس نسخے پر تاتاریوں کے حملے کا سن بھی درج ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب پانی میں سے نکالی گئی ہے۔ کیا عجب کہ یہ نسخہ بغداد کے بیت الحکمت کی بچی کھچی نشانی ہو۔ ٹونک میں اس طرح کی دو کتابیں محفوظ ہیں۔

اسی طرح تفسیر جلالین کا ایک نسخہ ہے جس پر مولانا جامیؒ کی اپنی تحریریں جگہ جگہ موجود ہیں۔ پھر زیب التفسیر ہے جو اورنگ زیب کی بیٹی کے لئے کشمیر میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ فیضی کی تفسیر 'سواطع الالہام' ہے۔ اس پوری تفسیر اور اس کے مقدمے میں کوئی بھی نقطے والا حرف استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر 'الفوزالکبیر' سے کون واقف نہیں۔ ٹونک میں اس کا جو نسخہ ہے وہ شاہ صاحب کے ایک شاگرد عبدالہادی نے نقل کیا تھا مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس

پر خود شاہ ولی اللہ کے قلم کی تحریر موجود ہے۔

تصوّف پر ایک قابلِ ذکر کتاب مولانا جامیؒ کی 'نقد النصوص، ہے جس کے پہلے ہی ورق پر داراشکوہ نے لکھا ہے کہ کتاب کے بعض حاشئے خود مولانا کی تحریر ہیں۔ بعد میں کسی نے داراشکوہ کے دستخط مٹانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ نام اب بھی صاف پڑھا جاتا ہے۔

ایک اور نسخہ مسعودی کی تاریخ 'مروج الذہب، کا ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے ایک رتن عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانے میں رہ چکا ہے اور اس پر ان کی تحریر موجود ہے۔

ٹونک کے کتب خانے کی کچھ اور نادر کتابوں کے بارے میں صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب نے بتایا:

"یہاں کا ایک اور مخطوطہ تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ یہ دنیا کا واحد، منفرد نسخہ ہے جو نسب الانساب تاریخ راجستھان کے نام سے ہے۔ دوسرا قلعۂ رنتھمبور کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ اسی طرح زیب التواریخ کا نسخہ ہے جس کو میرے محب و مکرم منظور الحسن صاحب برکاتی نے ایڈٹ کر دیا ہے اور جس پر حکومت ہند سے ایوارڈ ملا ہے۔ زیب التواریخ کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے، اس کے علاوہ یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ اسی طریقے سے طبقات شاہجہانی ہے۔ سی۔ اے اسٹوری نے دنیا میں اس کے صرف چھ نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ اب تک کہیں اس پر کام نہیں ہوا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اسی طرح ہمارے ہاں ابن ندیم کا نسخہ ہے۔ اُسے دیکھنے کے لئے بغداد سے اسکالرز کی پارٹی ٹونک آئی تھی اور اس کی مائیکرو فلم بنا کر لے گئی۔ اسی طرح ہمارے ہاں 'احراز السیاستہ، کا ایک نسخہ ہے۔ یہ ایران کی تاریخ، ثقافت اور علم و ادب پر ایک نادر مخطوطہ ہے جو خود ایران کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔"

ٹونک کے اس کتب خانے میں ایک اور خزانہ محفوظ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ یہاں ریاست ٹونک کی سرکار کے بیس ہزار کاغذات، دستاویزیں، فائلیں اور بستے۔ اور ان سے بھی بڑھ کر ٹونک کی شرعی عدالتوں کے تیس ہزار فیصلے اور مقدموں کی دوسری دستاویزیں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ ریاست ٹونک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں تمام مقدموں کے فیصلے شرع کے مطابق ہوا کرتے تھے اور شرعی عدالت کے فیصلے کے آگے نواب اور رئیس وقت کے فیصلے مسترد کر دیئے جاتے تھے۔ یہ ریکارڈ ایک بہت بڑا اسلامی ثقافتی ورثہ ہے اور یقین ہے کہ یہ پچاس ہزار بستے اور فائلیں ہندوستان کے اس خطّے کی تاریخ کا ایک ایک باب ایسی تفصیل سے سنائیں گی کہ دُنیا سنا کرے گی۔

یہ ۴ دسمبر ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب حکومت راجستھان نے اس کتب خانے کو سرکاری ادارہ قرار دیا تھا۔ اس کا آغاز پچاس ہزار روپے کے چھوٹے سے بجٹ سے ہوا تھا اور اب کُل ملا کر چھ لاکھ روپے کا بجٹ ہے، چنانچہ اب یہاں تحقیق ہو رہی ہے، کتابیں شائع ہو رہی ہیں، نمائشیں اور توسیعی خطبات ہو رہے ہیں۔ مزید عمارتیں بنیں گی جن کے لئے سولہ لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے کام کے لئے اس ادارے میں صرف دس افراد کا عملہ ہے جو بہت کم اور ناکافی ہے۔ خوش قسمتی سے اس ادارے کو مولانا سید منظور الحسن برکاتی اور مولوی حکیم محمد عمران خاں صاحبان جیسے عالموں کی خدمات اور تعاون حاصل ہے اور یہ چھوٹا سا عملہ ملازموں سے زیادہ رضاکاروں کے انداز میں کام کر رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹونک کے شاہی محل کے اس علاقے میں ایک پورا کیمپس بنا دیا جائے جہاں کتابیں محفوظ کرنے کے لئے ائرکنڈیشنڈ کمرے ہوں، جلسہ گاہیں اور آڈیٹوریم ہوں۔ اسکالروں کی رہائش کا بندوبست ہو۔ چھاپہ خانہ ہو اور ساتھ ہی خوشنویسی اور خطاطی کا مدرسہ ہو کیونکہ فنِ خطاطی کے جیسے نمونے اور شاہکار ٹونک میں محفوظ ہیں شاید ہی کہیں ہوں۔ یہاں خطِ نسخ اور خطِ تعلیق بھی ہے۔ پھر اُن سے مل کر بننے والا خطِ نستعلیق ہے۔ خطِ شفیعہ اور خطِ شکست تو رہے ایک

طرف، یہاں خط گلزار، خط ماہی، خط طاؤس، خط ہلال، خط گوہر، خط خشت، خط غبار، خط لرزہ، خط زلف عروس، خط منشور، خط طغرہ، خط ناخن، خط معکوس، خط توام، خط گنج و پیوند اور خط خوردبینی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

اور اب ایک آخری بات! راجستھان بلاشبہ ہندوستان کا واحد صوبہ ہے جو عربی اور فارسی کے تحفظ اور فروغ کے لئے اتنے جتن کر رہا ہے۔ شوکت علی خاں شہر کی دکانوں کے اوپر کسی کمرے میں بند کتب خانہ سعیدیہ کی یہ عربی فارسی کتابیں یقیناً شاہی محل میں سے آئے ہیں لیکن دکھ کی بات ہے کہ اُردو کی نہ معلوم کتنی کتابیں اب بھی شہر کی دکانوں کے اوپر ایک کمرے میں پڑی ہیں۔ نہ ان کی اچھی طرح حفاظت ہو رہی ہے نہ باقاعدہ دیکھ بھال۔ انہیں بچانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹونک کو ابھی ایک اَور شوکت علی خاں کی ضرورت ہے۔

وہ مکینک صاحب

پُرانی داستانوں میں ہم نے ایسے قصّے بار ہا پڑھے ہیں جن میں لوگ اندھیرے غاروں اور سرنگوں میں چلتے گئے، چلتے گئے —— اور اچانک ایک چمکتے، جگمگاتے محل میں نکلے جس کے طاقوں میں ہیروں کے، نیلم، پکھراج اور زمرّد کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بھی یہ ہیرے اور موتی فرش پر یوں گرنے لگتے تھے جیسے بہت بڑے نقارے پر بارش کی موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ چھوٹے بڑے اولے بھی گرا کرتے ہوں۔

کچھ ایسا ہی ایک منظر ہم نے دکن کی سطح مرتفع پر آباد گنبدوں، میناروں، فصیلوں، محرابوں، باغوں اور فوّاروں کے شہر حیدرآباد میں بھی دیکھا۔

باغِ عامہ کے سامنے ایک گلی میں پہنچ کر ہم ایک ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ بالٹیوں کو بھرنے والی ٹونٹیوں سے ٹکراتے اور ربڑ کے پائپوں کو پھلانگتے، بوسیدہ اور پُرپیچ سیڑھیوں پر چڑھتے۔ نیچی چھتوں سے سر ٹکرا جانے کے خوف سے جُھکتے جُھکتے، ہم اس آدھی پکی آدھی کچی عمارت کی چھت پر پہنچے اور وہاں بعد میں تعمیر کئے گئے نسبتاً نئے اور کشادہ کمرے میں

داخل ہوتے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مچانوں پر اور طاقوں میں کتابیں ہی کتابیں چنی ہیں۔ رسالوں، دستاویزوں، قلمی نسخوں، بھاری بھرکم جلدوں اور وزنی مطبوعات کے وہاں ڈھیر لگے ہیں اور ان کو چن چن کر سجانے والا ایک شخص سہما بیٹھا ہے کہ کہیں ہوا کا کوئی ذرا سا جھونکا انہیں اڑا نہ لے جائے۔

یہ اسی سہمے ہوئے شخص کی داستان ہے۔

محمد عبدالصمد خاں پیشے کے اعتبار سے موٹر مکینک تھے مگر ذوق کے اعتبار سے کتابوں کے شیدائی تھے۔ ہفتے بھر موٹروں کی مرمّت کرتے تھے اور چھٹی والے دن نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر کتابیں جمع کیا کرتے تھے۔ آخر یہ ہوا کہ اس دوڑ میں نئے زمانے کی تیز رفتار کاریں پیچھے رہ گئیں اور پرانے زمانے کی بوجھل کتابیں آگے نکل گئیں۔ عبدالصمد خاں نے اپنا موٹر گیراج بند کیا اور اپنے کتب خانے کو اردو ریسرچ سنٹر کا نام دے کر اُسے تحقیق اور مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے عام لوگوں کے لئے کھول دیا۔

صرف دس بارہ برسوں میں وہ سات ہزار کتابیں، بتیس ہزار رسالے، پانچ سو قلمی نسخے، دو سو سفرنامے، ڈھائی تین سو تذکرے، پچاس لغات اور ان گنت کتابچے جمع کر چکے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج سینکڑوں طالب علم اور اساتذہ محقق اور مدیر اُن کے کتب خانے سے فیض اٹھا رہے ہیں، مگر یہ داستان کچھ اتنی خوشگوار بھی نہیں۔ میں عبدالصمد صاحب کے کتب خانے میں پہنچا اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو وہ مجھے ساتھ لیکر چلے۔ چلتے جاتے تھے اور کتابوں کی باتیں کرتے جاتے تھے، کہنے لگے:

"یہ دیکھئے خواتین کے رسالے ہیں جن کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے! اس کے بعد یہ اردو میں طنز و مزاح کی کتابیں ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ڈھائی سو ہے! اس سے آگے ڈرامے کی اور فن ڈرامہ کی کتابیں ہیں۔ اور یہ نیچے قدیم داستانیں ہیں۔ ان کا بھی اتنا بڑا ذخیرہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔

اس طرف مذہبی کتابیں ہیں۔ ادھر تاریخ ہے۔ اور یہ شعرا کے تذکرے ہیں۔ ان کی بھی اتنی بڑی تعداد شاید ہی کہیں ملے۔ ان کی کل تعداد پونے تین سو ہے۔ ادھر یہ مختلف

رسالے ہیں۔ ان کو جہاں جگہ ملی ہے وہیں رکھ دیئے گئے ہیں۔

اور یہ پوری الماری سیرت، سوانح اور خود نوشت سوانح کے لئے مخصوص ہے! اس طرف قدیم غزل گو شعراء کا کلام ہے اور ان کا انتخاب ہے۔ اور ادھر نظمیں، مثنویاں منظوم داستانیں وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد یہ انیسویں صدی کی کتابیں ہیں۔ ان میں زیادہ تر مسودے ہیں۔ مثلاً یہ چراغ علی صاحب کے اٹھائیس مسودے ہیں۔ اسی طرح یہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کا کلام ہے جو کنگ کوٹھی سے استاد جلیل کے پاس جاتا تھا اخباروں میں شائع کرنے کے لئے۔ یہ اس کا پورا فائل ہے۔

یہ کشن پرشاد شاد کا کلام ہے جس کی حیدر یار جنگ اور ضیاء یار جنگ نے اصلاح کی ہے۔ اسی طرح اس الماری میں بھی مسودے بھرے ہیں۔ جو میں ابھی تک پوری طرح سے ٹھیک نہیں کر سکا۔

اب یہ رسالے ہیں۔ ان کے میں نے الگ الگ فائل بنا دیئے ہیں۔ مثلاً نگار ہے۔ نگار کا میرے پاس مکمل سیٹ ہے۔ یعنی ۱۹۲۲ء سے لے کر اب تک؛ اسی طرح اورنگ آباد کا مجلّہ اردو ہے جو بعد میں پاکستان سے بھی شائع ہوتا رہا۔ اس کے ۱۹۵۶ء تک مکمل فائل یہاں موجود ہیں۔

یہ غالبیات پر ساری کتابیں ہیں اور ادھر اقبال پر شائع ہونے والی کتابیں ہیں۔ رسالوں نے جو غالب نمبر شائع کئے ہیں۔ اُن کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ اقبال نمبر بھی اسی کے قریب ہیں۔ یہ خاص گوشہ ہے مصنفین کی دستخط شدہ کتابوں کا۔ ان پر بہت دلچسپ فقرے بھی لکھے ہیں۔ یہ تنقید، تحقیق اور حوالے کی کتابوں کا پورا گوشہ ہے۔ ادپر رپورٹیں ہیں۔ یہ مختلف اردو اور تعلیمی انجمنوں کی رپورٹیں ہیں۔ جیسے یہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کی مکمل رپورٹیں ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ تحریک کی رپورٹیں اور خطبات یہاں جمع ہیں۔

ادھر سفر نامے ہیں۔ یہ کیٹلاگ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے سبھی کتب خانوں کے تاجر ان کتب کے کیٹلاگ ہیں۔ میرے پاس جو پہلی فہرست کتب ہے وہ ۱۸۹۲ء کی ہے۔

اور یہ دیکھئے قلمی نسخے ہیں۔ وہ اوپر سب اردو کے ہیں۔ نیچے فارسی کے ہیں۔ اور سب سے نیچے عربی مسودے ہیں۔

ادھر یہ تینوں الماریاں رسائل کی ہیں۔ اور یہ وہ کچرا ہے جو میں صاف نہیں کر سکا۔ رسائل کی تعداد بہت ہے۔ ہم نے ابھی تک ۳۲ ہزار کی فہرست بنا لی ہے۔ انیسویں صدی کے جتنے بھی اہم رسالے تھے ان کی ایک آدھ کاپی تو آپ کو یہاں ضرور مل جائے گی۔ ان میں سے بعض تو بالکل گمنام ہیں۔

سرسید کے تہذیب الاخلاق کے پانچ سال کے فائل میرے پاس ہیں۔ مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کا مکمل فائل ہے۔ "زمانہ" کے مکمل پرچے اب کسی کے پاس نہیں میرے پاس وہ تقریباً مکمل ہیں۔"

میں نے صمد صاحب سے پوچھا کہ اپنی یہ لائبریری قائم کرنے کا خیال کب آیا آپ کو؟ میں نے سوچا تھا کہ وہ آٹھ دس سال کی بات کریں گے لیکن وہ کہنے لگے:

"میں جس زمانے میں جامعہ ملیہ دہلی کی جماعت دوم اور سوئم میں پڑھتا تھا، اس وقت جو کتابیں مجھے انعام ملتی تھیں یا جو میں خریدتا تھا وہ کتابیں اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور اس کے بعد ہر دور میں کتابیں جمع کرتا رہا۔ دو سال پیشتر لندن سے ڈیوڈ میتھیوز صاحب کے آنے کے بعد ہی یہ خیال ہوا کہ ہم اس کو ایک ریسرچ سنٹر میں تبدیل کریں تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مگر اب افسوسناک بات یہ ہے کہ میں خود اس سے تنگ آگیا ہوں۔ میں شاید بہت جلد اسکول بند کر دوں۔"

ان کی یہ بات سن کر میں چونک پڑا اور پوچھا "وہ کیوں؟"

کہنے لگے" بھئی یہ تو میرے لئے بالکل ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔ مثلاً یہ مخطوطے اور قلمی نسخے ہیں، ان کو میں اگر محفوظ کرنے کی کوشش کر دوں تو میرے تیس چالیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ میرے بجٹ کا مسئلہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کتابیں میں اسطرح خریدتا ہوں کہ میں اگر کھانا کھانے جا رہا ہوں اور راستے میں کوئی کتاب فروخت ہو رہی ہو تو سوچتا ہوں کہ چلو بھئی آج رات کا کھانا نہ سہی، کل ناشتہ ہی کر لیں گے۔ یہ سوچ کر کتاب خرید لیتا ہوں۔ مگر اس طرح کتابیں تو میں نے بہت جمع کر لی ہیں لیکن ان کو رکھنا اور حفاظت سے رکھنا میرے لئے ناممکن ہوگیا ہے۔"

اس پر میں نے کہا کہ یہ تو بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اس کے پیچھے بڑی محنت ہے اور لگن اور اشتیاق ہے جن کے بغیر کتب خانہ نہیں بنتا۔ اس کے بعد آپ اتنی آسانی سے اسے کیسے اپنے آپ سے جدا کر سکتے ہیں؟

اس پر صمد صاحب کہنے لگے" صاحب اب مشکل تو یہ ہے کہ یہاں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ اس ریسرچ سنٹر کی کمیٹی میں آپ جو نام دیکھیں گے وہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ دو سال کے عرصے میں کسی نے بھی آکر یہ نہیں پوچھا کہ ادارہ کیسے چل رہا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ فوٹو کاپی کا ہے۔ صفحات کے عکس منگائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تعلیمی اداروں سے اور پاکستان سے مواد کے لئے بہت خطوط آتے ہیں اور خدا کے فضل سے ہم نے اب تک سبھی کو حسبِ خواہش مواد بھجوایا۔"

میں نے پوچھا" بالکل راہِ خدا میں؟"

ہنس کر کہنے لگے" راہِ خدا کہیئے یا ذوق کی تسکین کہیئے۔ لیکن اب تھک گیا ہوں۔"

اور آخر میں انہوں نے سارا بھید خود ہی کھول دیا۔ بولے:

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کو برداشت کر لیتا ہے، مجھے جو سب سے بڑی شکایت ہے وہ یہ کہ یہاں کا جو ادبی حلقہ ہے، وہ مجھے موٹر مکینک سے اوپر

ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب بات پائیں گے آپ، کہ وہ اساتذہ بھی جن کے لڑکے میرے پاس تحقیق کرتے ہیں اور پورا مواد حاصل کرتے ہیں، وہ بھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ارے بھئی وہ مکینک صاحب، ان کو کیا پتہ۔ بس کتابیں جمع کر لی ہیں تھوڑی سی، یہ رویّہ بڑا تکلیف دہ ہے۔"

تو یہ تھا عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ جس کے متعلق کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ کہنے کو یہ ادارہ ہے مگر اسے ایک فرد کے اضطراب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی تنہا روی اور سوزِ دروں سے ایک ادبی گھروندا تعمیر کیا ہے۔

کاش اس داستان کا انجام بخیر ہو اور ہم کہہ سکیں کہ عبدالصمد خاں اور ان کے کتب خانے نے باقی زندگی ہنسی خوشی گزاری۔

کچھ بھی ہو، دل کو ایک دھڑکا سا ہے۔

تاریخ چاہے کچھ کہے

"اُن کا کہنا تھا کہ اپنی کتابوں کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتا ہوں۔ اُن کے آخر وقت کا ایک واقعہ ہے۔ جب مرض الموت اُن پر طاری ہُوا، وہ اس وقت اپنے گھر کا نقشہ بھول گئے تھے۔ یعنی کہتے تھے کہ مجھے اب یاد نہیں آرہا کہ میرے گھر میں کوٹھے کے اوپر کیا بنا ہوا ہے یا جس دالان میں میں لیٹا ہوا ہوں اس کی داہنی طرف کونسا حصّہ ہے۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ جس الماری میں واجد علی شاہ کی کتابیں ہیں، وہ کھول کر چار پانچ کتابیں لاؤ اور میں دیکھوں کہ آیا اب بھی ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتا ہوں یا نہیں؟ سب کو تو نہیں لیکن کچھ کتابوں کو انہوں نے پہچان لیا۔"

یہ تذکرہ ہے لکھنؤ کے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا۔ اور یہ مثال ہے اُن گِنے چُنے لوگوں کی جنہوں نے کتاب کو بھی ویسے ہی چاہا جیسے اولاد کو۔

یہاں ہم لکھنؤ کے کتب خانوں اور دستاویزوں کے ذخیروں کی بات کر رہے ہیں۔

تاریخ چاہے کچھ بھی کہے ، اس شہر کی روایت یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے اُس وقت چھاپہ خانہ لگایا جب بہت سے ہندوستانیوں نے کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ان سے اودھ چھٹا تو علم کا ذوق ساتھ لئے وہ کلکتے پہنچے اور وہاں بھی سب سے پہلے وہی مطبع سلطانی قائم کیا اور مشین سے رات دن کتابیں نکلتی رہیں۔

مگر پھر جو حشر لکھنؤ کا ہُوا وہی اس کے کتب خانوں کی درگت بنی۔زوال آیا تو بنیادوں میں اتر گیا چنانچہ علم کی وہ شاندار عمارتیں کبھی کی ڈھے چکی ہیں۔

جو کچھ بچا ہے ، اس کی دیواروں میں بھی شگاف ہیں۔

لکھنؤ کے کتب خانوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو سب سے پہلے امیر الدولہ پبلک لائبریری کا نام آتا ہے جہاں اردو، فارسی اور عربی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے خصوصاً تاریخ کے موضوع پر یہ جگہ کسی خزانے سے کم نہیں۔اس کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی کا کتب خانہ ہے جو ٹیگور لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔یہاں بھی چھپی ہوئی اور ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔لیکن ان کتب خانوں میں تحقیق کرنے والے اسکالروں کو بہت تشویش ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ان کا انتظام اچھا نہیں ،خصوصاً اردو کتابوں کی حالت خراب ہے۔اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کتب خانوں کا جو عملہ ہے اس میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اردو سے واقف ہی نہیں۔

تو اب صورت یہ ہے کہ محقق خود ہی جائیں اور سرگردانی کریں تو عجب نہیں کہ الماریوں اور بستوں کے اندر سے ایسے ایسے دربیش بہا نکلیں کہ دنیائے علم کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔مثلاً لکھنؤ کی امیر الدولہ لائبریری کے بارے میں اردو کے مشہور محقق مشفق خواجہ نے بتایا :

” وہاں ابھی ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے مخطوطات پر کام کیا تو بڑی عجیب عجیب چیزیں وہاں سے نکل رہی ہیں۔شعراء کے خود نوشتہ دواوین اور بعض تصانیف جو انہوں نے اپنے قلم سے لکھی تھیں وہاں دستیاب ہوئی ہیں۔لکھنؤ میں ایک اور چیز بھی ہے جو تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اسے ابھی

تک عام نہیں کیا گیا اور وہ ہے وثیقہ آفس کا ریکارڈ۔ وہاں پر لکھنؤ کے شاہی خاندان سے متعلق افراد کے بارے میں جتنی معلومات موجود ہیں وہ کسی دوسری جگہ نہیں، کاش وہ اس ریکارڈ کو شائع کر دیں۔"

لکھنؤ کے وثیقہ آفس کا ذکر نکل آیا تو شہر کے اسٹیٹ میوزیم کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اس بارے میں اردو اور فارسی کے محقق اور استاد ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نے بتایا۔

"ایک اور اچھا مخزن کتابوں کا، اور کتابوں سے زیادہ دستاویزوں کا، لکھنؤ کے اسٹیٹ میوزیم میں ہے۔ یہاں خرابی یہ ہے کہ یہاں، مثلاً پورے پورے بستے ہیں اور فہرست میں صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ 'منتشر تحریروں کا ایک بستہ'۔ یا اگر بیاض ہے تو 'متفرق تحریروں کی بیاض'۔ لیکن وہ متفرق تحریریں کیا ہیں؟ کس کی ہیں؟ کتنی اہم ہیں؟ اس کا اس میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور وہاں بھی وہی دقّت ہے کہ وہاں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ فارسی نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں۔ وہ پرانی فارسی اور پُرانی تحریر کو پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تو اس وجہ سے اس کی کیٹلاگنگ نہیں ہو سکی ہے۔"

لکھنؤ کا جو کتب خانہ خصوصیت سے قابلِ ذکر اور قابلِ تعریف ہے وہ ندوۃ العلماء کا کُتب خانہ ہے جس میں اُردو، فارسی اور عربی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ ایک تو خود اس ادارے نے علم کی راہوں میں کتابوں کے بے شمار چراغ روشن کیے ہیں، دوسرے یہ کہ نہ معلوم کتنے اہلِ علم حضرات نے اپنے پورے پورے ذخیرے ندوۃ العلماء کو تحفے کے طور پر دے دیئے۔ مثلاً مولانا عبدالحی کا بے مثال کتب خانہ منتقل ہو کر ندوۃ العلماء میں چلا آیا۔ اس طرح یہ ذخیرہ مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کا انتظام بھی بہت اچھا ہے۔ اگر آپ کو کوئی کتاب درکار ہے تو فوراً ملے گی، اچھی حالت میں ملے گی اور اپنی جگہ پر ملے گی۔

دینی مدرسوں نے شہر لکھنؤ کو بہت سے کتب خانے دیئے ہیں، مثلاً کتب خانہ ناصریہ جو مولانا ناصر الملّت کا قائم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح مدرسۃ الواعظین، سلطان المدارس، مدرسہ ناظمیہ، مدرسہ فرقانیہ

ان سب کے اپنے اپنے کتب خانے ہیں جو اگرچہ دینی کتابوں کے لئے مخصوص ہیں لیکن ان میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً فارسی تذکرے، نشترِ عشق، کا ایک بہت اہم مخطوطہ سلطان المدارس میں ہے مگر اُس سے شاید ہی کوئی فائدہ اٹھاتا ہو۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے!

اس کے بعد آیئے شہر لکھنؤ کے ذاتی کتب خانوں میں چلیں۔ کبھی سینکڑوں ہوں گے مگر اب شمار کرنے کے لئے دو ہاتھوں کی انگلیاں بہت ہیں۔

سب سے پہلے ذاتی ذخیرہ ریاست محمود آباد کا ہے۔ اس کتب خانے کی مطبوعہ کتابیں تو محمود آباد ضلع سیتاپور میں ہیں لیکن تمام قلمی نسخے لکھنؤ کے محمود آباد ہاؤس میں محفوظ ہیں۔ چونکہ راجاؤں کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ہے اس لئے اس میں بعض نہایت اہم مخطوطے ہیں۔ اس کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بتایا۔

"جتنے بھی کلکشن پرائیویٹ تحویل میں رہتے ہیں ان سے عوامی سطح پر استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔ برسوں ایسے کتب خانوں اور ذخیروں کے تالے بھی نہیں کھولے جاتے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مہاراجا صاحب محمود آباد کی علم پروری، اردو دوستی اور ان کی علم دوستی کی وجہ سے ہمارے دوست اکبر حیدری صاحب کو، جو کشمیر میں پڑھاتے ہیں اور لکھنؤ آتے جاتے رہتے ہیں۔ مہاراجا صاحب کی وساطت سے کئی بار موقع ملا ہے۔ وہ کتب خانہ ہر شخص کے لئے نہیں کھلا ہے لیکن اکبر حیدری صاحب نے وہاں سے دیوانِ میر لیا۔ انیس کے بہت سے نادر مراثی اور بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں دریافت کی ہیں۔"

لکھنؤ میں دوسرا بڑا ذخیرہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کا ہے۔ یہ ایک فردِ واحد کی کوشش، لگن اور علم سے عشق کا نتیجہ ہے۔ وہ ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ لکھنؤ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تھے اور اسی وقت سے کتابیں اس طرح جمع کر رہے تھے کہ خود اپنے بہت سے ضروری اخراجات ترک کر دیئے تھے۔ ان کے کتب خانے میں اردو اور فارسی کی بعض کتابیں نہایت نادر ہیں۔ خاص طور پر مرثیوں کا ذخیرہ اُن سے بہتر کسی کے پاس نہ تھا۔ اسی طرح واجد علی شاہ کی جتنی تصانیف مسعود حسن رضوی ادیب کے ذخیرے میں موجود ہیں کہیں اور نہ ہوں گی۔ ان کے شاندار ذخیرے کا قابلِ قدر حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کو دے دیا گیا ہے۔

جنہیں علم کی لگن ہو اُن کا بڑا عالم، محقق، استاد یا راجا مہاراجا ہونا ضروری نہیں۔ لکھنؤ اس معاملے میں بڑا خوش نصیب شہر ہے۔ مسعود حسن رضوی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے ایک دلچسپ شخصیت کے بارے میں بتایا:

"محمد رشید صاحب سیکرٹریٹ میں ملازم ہیں۔ کوئی بڑے عہدے پر نہیں ہیں۔ لیکن انکے شوق کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی کتاب ان کو نظر آجائے جو برائے فروخت نہیں ہے تو وہ پوری کتاب نقل کرلیں گے۔ خود میرے والد مرحوم کے ذخیرے کی بعض کتابیں جو تین تین سو صفحے کی تھیں، وہ انہوں نے عاریتاً لیں اور تین تین چار چار راتیں جاگ جاگ کر خود، اور گھر والوں کو ملا کر پوری پوری کتاب نقل کی ہے۔ یا کسی رسالے میں کوئی اچھا مضمون نظر آیا اور وہ رسالہ ان کی دسترس میں نہیں ہے۔ تو وہ پورا مضمون نقل کرلیا۔ اس کے علاوہ کتابیں خریدتے بھی ہیں۔ جب تک اس ذخیرے کو آنکھ سے دیکھا نہ جائے یقین نہیں آتا کہ ان کے پاس اتنی اہم چیزیں ہیں۔ دوسرے ان کے ذخیرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ذخیرہ ہے حالانکہ ذاتی ذخیروں میں سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ لوگ کسی کو آنے نہیں دیتے لیکن رشید صاحب کا یہ حال ہے کہ آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو، آپ اُن سے کہیئے۔ نہایت خندہ پیشانی سے وہ آپ کو بلائیں گے۔ آپ کی خاطر تواضع کریں گے۔ جتنی کتابیں آپ کو چاہئیں وہ آپ دیکھئے اور اگر بہت قیمتی کتاب نہیں ہوتی تو وہ آپ کو دے بھی دیں گے کہ اپنے گھر پر لے جاکر کام کیجئے۔ اس کے علاوہ مثلاً باہر سے آپ ان کو خط لکھیں کسی چیز کے بارے میں، تو اگر بیس پچیس صفحے تک کا معاملہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے نقل کر کے آپ کو بھیج دیں گے میں تو اُن کو چھوٹا برٹش میوزیم کہتا ہوں۔ جس طرح ان معاملات میں برٹش میوزیم بہت مستعد ہے اُسی طرح ہمارے رشید صاحب بھی ہیں"

اسی طرح لکھنؤ کے اسلم محمود صاحب ہیں جو وزارتِ قانون میں اوقاف کے شعبے میں ملازم ہیں۔ ان کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے اور اس مد میں وہ بڑی رقم صرف کرتے ہیں۔ ان کے احباب بتاتے ہیں کہ وہ جب کبھی سرکاری دوروں پر جاتے ہیں۔ تو الاؤنس کی ساری رقم کتابوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو یورپ میں چھپی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پہلی کاپی اسلم محمود صاحب کے پاس آئی ہے۔ پاکستان میں چھپنے والی تمام اہم کتابیں ہندوستان میں اَور کسی کے پاس ہوں یا نہ ہوں، اسلم محمود صاحب کے پاس یقیناً ہوں گی۔

ایک اَور صاحب کے بارے میں نیرّ مسعود رضوی صاحب نے بتایا:

"محمد اسحٰق صدیقی صاحب ہیں۔ رشید صاحب اور اسلم صاحب کو صرف کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے، خود لکھتے نہیں ہیں۔ اگرچہ میں بہت اصرار کرتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی مستفید کیجئے اپنے مطالعہ سے، لیکن وقت نہیں ملتا، کچھ اس طرف ان لوگوں کی طبیعت نہیں آتی۔ اسحٰق صدیقی صاحب لکھتے بھی ہیں۔ علمی موضوعات، سائنسی موضوعات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، اس طرح کے مضامین برابر لکھتے ہیں۔ کئی کتابیں بھی ان کی چھپ چکی ہیں اور ایک کتاب پر یونیسکو کا انعام بھی مل چکا ہے۔ لیکن وہ بھی محدود وسائل کے آدمی ہیں البتہ جہاں تک ہوسکتا ہے، جتنی گنجائش نکل سکتی ہے، وہ سب کتابوں کی خریداری پر صرف کر دیتے ہیں۔ دفتی کے ڈبے لالا کر جمع کریں گے، پھر اس میں کتابیں سجائیں گے۔ ان کو ایک اور بہت دلچسپ شوق اخباروں کے تراشے جمع کرنے کا ہے، اور بڑی ہی خوش ترتیبی کے ساتھ ہزاروں تراشے جمع کئے ہوئے ہیں۔ آپ جس موضوع پر چاہیں اُن سے اخباروں کے پچاس ساٹھ تراشے حاصل کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی اسی طرح کمربستہ ہیں کہ جب آپ کو کوئی ضرورت ہو وہ حتی الامکان آپ کی مدد کریں گے۔"

اس کے بعد نیرّ مسعود رضوی صاحب نے کہا کہ ان کے نزدیک یہ ذاتی ذخیرے والے

حضرات زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ذخیروں کی باقاعدہ فہرست سازی ہونی چاہیئے کیونکہ اس میں دقت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص خود کتابیں جمع کرتا ہے اس کو ہر کتاب کا پورا احوال معلوم ہوتا ہے لیکن بعد والوں کے لئے بڑی پریشانی ہو جاتی ہے۔ نیّر مسعود رضوی صاحب کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ ان کے والد پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے میں پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ خود پروفیسر صاحب کو ہر کتاب کا علم تھا چنانچہ فہرست کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ نیّر مسعود صاحب کے بقول "آبا کو اگر کوئی کتاب نکلوانا ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ فلاں کمرے میں فلاں الماری ہے، اس کے تیسرے خانے میں داہنے ہاتھ سے پانچویں کتاب ہے، اتنی موٹی ہے، سُرخ رنگ کی جلد ہے اور کتھئی رنگ کے چمڑے کی پُشتی ہے"۔ اُن کے والدِ محترم کے بارے میں یہاں تک کا احوال تو آپ نے مجھ سے سُنا، باقی نیّر مسعود رضوی صاحب کی زبانی:

"اُن کا کہنا تھا کہ اپنی کتابوں کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتا ہوں۔ اُن کے آخر وقت کا ایک واقعہ ہے۔ جب مرض الموت اُن پر طاری ہوا وہ اس وقت اپنے گھر کا نقشہ بھول گئے تھے۔ یعنی یہ کہتے تھے کہ مجھے اب یاد نہیں آرہا کہ میرے گھر میں کوٹھے کے اوپر کیا بنا ہوا ہے یا جس دالان میں لیٹا ہوا ہوں اس کی داہنی طرف کونسا حصّہ ہے؟ اُس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ جس الماری میں واجد علی شاہ کی کتابیں ہیں وہ کھول کر چار پانچ کتابیں لاؤ اور میں دیکھوں کہ آیا اب بھی ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتا ہوں یا نہیں؟

اور سب کو تو نہیں لیکن کچھ کتابوں کو انہوں نے پہچان لیا۔ تو یہ جو دقت ہے کہ انہوں نے تو پہچان لیا لیکن میں نہیں پہچان سکتا ہوں۔ اب اگر آپ مجھ سے واجد علی شاہ کی کوئی کتاب مانگیں گے تو میں بیس کتابیں سر کاؤں گا تب وہ ملے گی۔ اور ان ہزاروں کتابوں میں ظاہر ہے کہ کچھ اندازہ تو ضرور ہے کہ کون کتاب کہاں ملے گی لیکن

جیسے وہ اپنے وقت میں، اپنی زندگی میں، ایک منٹ کے اندر کتاب نکال لیتے تھے، میں اتنی جلدی نہیں نکال سکتا۔ تو اب اس فکر میں ہوں کہ اس کی باقاعدہ کیٹلاگنگ ہو، لیکن اس میں وہی، کہ اپنے ذاتی، دوسرے کام یا مصروفیتیں وغیرہ ہیں ان کی وجہ سے ہو نہیں پا رہا ہے۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے اور اس میں کوئی قدم کسی قسم کا اٹھانا چاہیئے تاکہ ذاتی ذخیروں کی فہرست سازی بہت قاعدے سے ہو جائے۔ اس لئے کہ بہت اہم کتابیں ذاتی ذخیروں میں موجود ہیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔"

علم اونچا ہوا ہے

میں کتاب کے موٹے موٹے ورق پلٹ رہا تھا۔ ایک ہزار سال پرانی عربی کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنی ناکامی پر خود ہی مسکرا رہا تھا۔ اچانک ایک ورق کے بیچوں بیچ بڑا سا گول سوراخ نظر آیا۔ صفحے کے وسط میں گول سوراخ کا کیا کام؟ اور سوراخ بھی اتنا بڑا کہ کاتب لکھتے لکھتے جب اس جگہ پہنچا تو سوراخ کو پھلانگ کر نکل گیا اور آگے لکھنا شروع کر دیا۔

کسی نے مجھے بتایا: اس جگہ ہرن کی ناف تھی۔

۴۱۲ھ میں امام مالکؒ کی یہ فقہ ہرن کی کھال پر لکھی گئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں یہی سب سے قدیم کتاب تھی۔

کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا، گویا پیدا ہی نہیں ہوا، اور میں بڑے ادب سے اس میں یہ اضافہ کر دوں کہ جس نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کا کتب خانہ نہیں دیکھا، گویا ان پڑھ رہا۔

لاہور کی اور علم و حکمت کی باتیں ساتھ ساتھ چلیں تو شاید کبھی ختم نہ ہوں۔ کیسا گہوارہ رہا ہے

تعلیم اور دانش کا اور کیسی درس گاہ بنا ہے ادب کی اور شاعری کی۔

ابھی کچھ روز ہوئے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اپنے زمانے کے لاہور کی، اور اُس وقت کے اہلِ علم اور اہلِ ادب کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی زبان پر اتنے بہت سے نام آئے کہ تسبیح چھوٹی پڑ گئی۔ کہنے لگے:

"دوسری عالمگیر جنگ ستمبر ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے جو سات آٹھ سال کا عرصہ گزرا ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لحاظ سے لاہور کا سب سے روشن اور بھرپور دور تھا۔ پھر وہ دور نہیں آیا۔

لاہور کے اورینٹل کالج میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، پروفیسر محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، گورنمنٹ کالج میں پطرس بخاری۔ اور پھر خود اقبال، ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، ہندوؤں میں لاجپت رائے؛ اور ہندو شعرا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تلوک چند محروم، نیلا رام وفا، نانک چند ناز، اُودے سنگھ شائق، کرپال سنگھ بیدار، سوہن لال ساحر۔ اردو نثر لکھنے والوں میں کرشن چندر وغیرہ۔ اُبھر رہے تھے۔ اُپندر ناتھ اشک، کنہیا لال کپور، یہ سب اردو لکھتے تھے۔ سیاست کی بات اَور ہے لیکن اُس وقت نہ ہندی کا چرچا تھا نہ گورمکھی کا چرچا تھا۔ اردو چلتی تھی۔"

ایسے لوگوں کے شہر میں علم خوب پھلا پھولا۔ کتب خانوں کی الماریاں دیکھتے دیکھتے بھرنے لگیں اور حقیقت یہ ہے کہ لائبریریاں اُبل پڑیں۔ اِس وقت لاہور میں تین بڑے کتب خانے ہیں: پنجاب پبلک لائبریری، جسے قائم ہوتے سو برس ہو رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۸۸۲ء میں جس کی عمر کے سو سال پورے ہوئے۔ اور سردار دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری جو امرتسر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک باشندے کی ایسی شاندار یادگار ہے کہ جس سے اس کا نام بھی زندہ ہے اور علم کو پھیلانے کی اُس کی تمنا بھی؛

اور اب ایک چوتھا مینار بلند ہو رہا ہے۔ لاہور کے باغ جناح میں قائد اعظم لائبریری قائم ہو رہی

ہے۔ یہ جدید کتب خانہ ہو گا جو نئے دور کے نئے تقاضے پورے کرے گا۔

مگر اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اہلِ نظر جو نئے نئے کتب خانے تعمیر کر رہے ہیں۔ ضرور کریں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ پرانے کتب خانوں کا کیا ہو گا؟ کتابوں کے قدیم ذخیروں کو اندھیرے کمروں اور سیلے ہوئے تہہ خانوں سے دن کی روشنی میں کون نکالے گا اور کیونکر؟ کیا اس تاریخی خزانے کو موسم کے اثرات سے محفوظ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں منتقل کرنا زیادہ اہم نہیں؟

پنجاب پبلک لائبریری کے بارے میں مشہور ہے کہ اُسے ایک چھوٹے سے پاکٹ کیلکولیٹر کی ضرورت تھی۔ پورے دو سال تک خط و کتابت کی گئی تب کہیں ۱۹۸۱ء کے آخر میں ایک جیبی کیلکولیٹر نصیب ہوا۔ اب اگر اُسی پر حساب لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ اُسے حاصل کرنے کی کوشش میں کام کے جتنے گھنٹے صرف ہوئے، اتنے گھنٹوں کی اُجرت میں ایک چھکڑا بھر کر کیلکولیٹر فراہم کئے جا سکتے تھے۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخری بیس پچیس برسوں میں انگریزوں نے برصغیر کے دو بازوؤں میں دو بڑے کتب خانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک کتب خانہ کلکتے میں قائم ہوا جو امپیریل لائبریری کہلایا، اور دوسرا کتب خانہ لاہور میں شاہ جہاں کے گورنر وزیر علیخاں کی تعمیر کی ہوئی عالیشان بارہ دری میں قائم ہوا۔

کلکتے کی لائبریری اب ہندوستان کی قومی لائبریری ہے اور ملک میں چھپنے والی ہر کتاب کی ایک جلد وہاں پہنچنا لازمی ہے۔ اس کے برعکس لاہور کی بارہ دری پر تاریکی، سیلن، مچھروں اور چمگادڑوں کا تسلّط ہے چنانچہ کتب خانے کو نکال کر بہتر عمارتوں میں بسا دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ ۱۹۸۱ء میں کسی کو خیال آیا کہ کتابوں کو شمار کیا جائے۔ رجسٹر میں سوا دو لاکھ کتابوں کا اندراج تھا مگر الماریوں میں رکھی ہوئی کتابیں گنی گئیں تو وہ ۴۴ ہزار کم تھیں۔ وقت کے ہاتھوں اُردو کی پندرہ ہزار اور انگریزی کی گیارہ ہزار کتابیں ضائع ہو چکی تھیں۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے ہنگاموں کے دوران جو خزانہ ہاتھ سے جاتا رہا، اُس پر تو اب صبر کر لینا ہی بہتر ہو گا لیکن ممتاز حسین صاحب نے اپنی بیٹی رفعت سُلطانہ کی یاد میں ٹرسٹ قائم کر کے لائبریری کو آٹھ ہزار سے بھی زیادہ

کتابیں دی تھیں، ان میں سے دیکھتے دیکھتے تقریباً چھ ہزار لاپتہ ہوگئیں۔ یہ ابھی حال ہی کی بات ہے۔

لوگ اوّل تو مطالعے کے لئے آتے نہیں اگر آتے ہیں اور کتابیں گھر لے جاتے ہیں تو پھر انہیں واپس نہیں لوٹاتے۔ صرف دس برسوں میں پونے دو ہزار کتابیں یوں جاتی رہیں۔ ایک نامور صحافی اور ادیب ہٹلر کی سوانح اپنے گھر لے گئے جو دو جلدوں میں تھی۔ انہوں نے پہلی جلد پورے دس سال بعد لوٹائی اور دوسری سے بالکل ہی انکاری ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود پنجاب پبلک لائبریری کی فہرستوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو انگریزی، اُردو، عربی اور فارسی کی بے مثال مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ صرف اسلامیات کے موضوع پر چھ ہزار کتابیں ہیں۔ مشرقی علوم کی جن کتابوں کا فہرست میں اندراج نہیں ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔

کتب خانے کا وہ شعبہ جو بیت القرآن کہلاتا ہے، اس میں قرآن اور تفسیر کے تقریباً تین ہزار ایسے نسخے جمع ہیں کہ جو دیکھے وہ دیکھتا ہی رہ جائے۔ اس کے علاوہ وہاں سنسکرت، گورمکھی اور ہندی کتابوں کا کافی بڑا ذخیرہ ہے۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی تقریباً اٹھارہ سو کتابیں ہیں جن میں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ پنجابی، ہندی، کشمیری، ترکی، پشتو، سنسکرت اور گورمکھی مخطوطے شامل ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری چونکہ قدیم ہے اس لئے اس میں پرانے اخباروں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے مگر اس پر بھی بڑا سانحہ گزرا ہے۔ مثلاً اخبار زمیندار۔ میں نے بہت ڈھونڈا اور کہیں نہ پایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کبھی موجود تھا اور بڑی آن بان سے تھا۔

ایک اور دولت جو اس خزانے میں موجود ہے وہ لاہور کے تاریخی پیسہ اخبار کی فائلیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبھی یہاں پیسہ اخبار کا ایک ایک شمارہ محفوظ تھا۔ اب پورے پورے برس کی فائلیں لاپتہ ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری کی بُنیادیں بہت شاندار ہیں۔ ان بُنیادوں پر ویسی ہی شاندار عمارت

کھڑی کر لی جاتی تو باغِ جناح میں نئے کتب خانے کے قیام سے کہیں بڑا کارنامہ ہوتا۔

بات شروع ہوئی تھی پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے جہاں اس وقت تین لاکھ کتابیں ہیں۔ انگریزی کو چھوڑ کر دوسری زبانوں میں وہاں اسی ہزار چھپی ہوئی کتابیں ہیں اور ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا حال یہ ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، پشتو وغیرہ کی دس ہزار اور دیوناگری رسم الخط میں آٹھ ہزار مخطوطے ہیں۔ کئی کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں اور ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ۴۱۲ھ کی فقہ امام مالک کا احوال آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ کتب خانہ یقیناً خوش نصیب ہے کہ اس کیلئے یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں بالکل نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔

لاہور کا تیسرا بڑا کتب خانہ وہ ہے جس کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی آج بھی سب سے پہلے ایک خوش شکل، وجیہ اور شاندار شخص کے سنگِ مرمر کے مجسمے سے ملاقات ہوتی ہے جو خود تو صحیح سلامت ہے، صرف آنکھوں کی پُتلیاں غائب ہیں۔

یہ سردار دیال سنگھ ہیں جن کی بڑی تمنا تھی کہ لاہور میں ایک شاندار کالج اور ایک کتب خانہ قائم کریں۔ یہ بھی شاید نیک نیتی کا صلہ ہے کہ تاریخ کے دھاروں کے رخ بدل گئے مگر دیال سنگھ کا کالج اور کتب خانہ بھی زندہ ہے اور خود اُن کا نام بھی۔

اُس وقت کی شاندار سڑک نسبت روڈ پر یہ کتب خانہ سردار صاحب کی وفات کے پُورے تیس سال بعد قائم ہوا تھا مگر برصغیر تقسیم ہوا تو اس کے تمام ٹرسٹی جو غیر مسلم تھے اسے بند کر کے ہندوستان چلے گئے اور یہ شاندار کتب خانہ پورے پندرہ سال بند پڑا رہا۔ بلکہ اس دوران ہندوستان سے آئے ہوئے بے گھر پناہ گزینوں نے اس میں رہائش اختیار کر لی۔ اور اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ کتب خانے کے اندر روزانہ دو وقت چولہا جلانے کے لئے ایندھن کہاں سے آتا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ پندرہ سال بعد جب دیال سنگھ لائبریری دوبارہ کھولی گئی تو اس کی کتابیں الماریوں میں کم اور نیچے فرش پر زیادہ تھیں اور اُن کا بڑا حصّہ ضائع ہو چکا تھا۔ لیکن اب خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ مرکزی حکومت کی مذہبی اور اقلیتی امور کی وزارت کی نگرانی میں ہے چنانچہ

کتب خانے میں زندگی کی لہر دوڑی ہے۔ یہاں مطالعے کے لئے آنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی، پھر کسی کو خیال آیا تو اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابوں کا بہت بڑا شعبہ کھول دیا گیا چنانچہ اب یہ کتب خانہ طالب علموں سے بھرا رہتا ہے۔

دیال سنگھ لائبریری میں کتابوں کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ کر سوا لاکھ ہو گئی ہے۔ ایک ہزار کے قریب قلمی نسخے ہیں جن کی تفصیلی فہرست چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

دیال سنگھ لائبریری پرانی اور نایاب کتابیں دوبارہ چھاپ رہی ہے۔ وہاں حیدرآباد کے مشہور جریدے "اسلامک کلچر" کے قدیم شماروں کی نئی اشاعت شروع ہوگئی ہے جو تیس جلدوں میں پھیلے ہوتے ہیں اور اسلامی ثقافت پر پورا انسائیکلوپیڈیا ہوں گے۔

لائبریری میں شعبۂ تحقیق موجود ہے جو اسلامی موضوعات پر ریسرچ کر رہا ہے اور اس نے "اسلام کا قانونِ شہادت" کے عنوان سے نئی کتاب شائع کی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں لائبریری کے فن کی تربیت شروع کی گئی ہے جس میں انڈر گریجویٹ نوجوان چھ ماہ کا کورس مکمل کر کے سرٹیفکیٹ پاتے ہیں۔ اس قسم کے اب تک سولہ سے زیادہ کورس ہو چکے ہیں۔

کتب خانے کی شان یہی ہے کہ وہ زندہ ہو، جیتا جاگتا ہو، متحرک ہو اور فعال ہو۔ وہ کسی نکڑ پر بنی ہوئی عمارت نہ ہو کہ صرف ضرورت مند چل کر وہاں آئیں بلکہ وہ خود چل کر جائے اور تاریک ذہنوں میں علم کی لو اونچی کرے۔ شکر ہے کہ لاہور میں علم کا یہ علم اونچا ہوا ہے۔

چور دلاور ہو گئے

ہم حیدر آباد کی کچّی اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اُس علاقے میں جا پہنچے جہاں ایک پرانا قبرستان تھا۔ ہر طرف بہت سے چھوٹے بڑے مقبرے تھے، کچھ ڈھے گئے تھے۔ اور کچھ مقبروں کی پیٹھ قدامت کے بوجھ تلے جُھک رہی تھی۔ بالآخر ہم ایک چھوٹے سے سالم اور ثابت مقبرے میں داخل ہوئے۔ درمیان میں کسی دکنی شہزادی کی قبر تھی جس پر سبز ریشمی چادر پڑی تھی اور اطراف میں دیواروں کے ساتھ ساتھ پُرانی کتابیں چنی تھیں۔ یہ سیّد محمد عبدالرزاق عرشی صاحب کا کتب خانہ تھا۔ مقبرہ بھی قدیم ہے، کتابیں بھی پُرانی ہیں اور خود عرشی صاحب بھی ضعیف ہیں۔ ان سے گفتگو ہوئی تو عرشی صاحب کی ذات گرامی اور شخصیت اس کتب خانے کی سب سے دلچسپ کتاب ثابت ہوئی۔

عبدالرزاق عرشی صاحب کو کتابوں سے والہانہ عشق تھا چنانچہ عمر بھر کتابیں جمع کرتے رہے، پڑھتے رہے، لکھتے رہے اور کتابوں کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ انہوں نے دکن کی سرزمین پر تقریباً تین چوتھائی صدی گزاری ہے۔ انہوں نے زمانے کے کتنے ہی سیلاب

آتے اور جاتے دیکھے ہیں۔ گھر بنتے اور اجڑتے دیکھے ہیں۔ کتب خانوں کی الماریوں میں سجی ہوئی کتابیں دیکھی ہیں۔ پھر ان ہی کتابوں کو بازاروں میں اونے پونے فروخت ہوتے دیکھا ہے۔

عرشی صاحب کتابوں اور کتب خانوں کی داستانیں سنا رہے تھے، میں شہزادی کی قبر پر کہنی ٹیکے بیٹھے تھا اور بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ بتا رہے تھے کہ دکن میں کسی زمانے میں کتابوں کے ذخیروں کی کیا آن بان تھی۔

”ہر گھر میں ذخیرہ ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر امراء اور رؤسا ہوتے تھے، چاہے وہ علم کی صلاحیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بحیثیت امیر ہونے کے ان کے لئے تین چیزیں لازمی تھیں۔ ایک سلاح خانہ، دوسرا کتب خانہ اور تیسرا جواہر خانہ۔“

کہنے لگے کہ کتنے ہی امیر اور نواب تو ایسے تھے کہ ان کے منشی کتابیں پڑھ کر انہیں بتا دیا کرتے تھے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ اس کے بعد یہ امراء اور رؤسا محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر ان کتابوں کی باتیں کچھ یوں کرتے تھے جیسے خود ان کے گھر میں تصنیف کی گئی ہوں۔

مگر خیر! وہ زمانہ بھی گیا اور وہ طور طریقے بھی رخصت ہوئے، میں نے عبدالرزاق عرشی صاحب سے پوچھا کہ اب اس نئے دور میں حیدرآباد میں کتنے کتب خانے ہیں؟ انہوں نے کہا۔

”حیدرآباد میں بیسیوں کتب خانے ہیں اور سب سے بڑا کتب خانہ تو اسٹیٹ لائبریری ہے۔ اس کو نواب عماد الملک، محسن الملک اور چراغ علی، یہ لوگ مل کر غالباً تیرہ سو ہجری میں قائم کئے۔ اس کی نظامت کے لئے مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی کو وہاں مہتمم کی خدمت پر فائز کیا گیا۔ عماد الملک محکمہ تعلیم سے خریدی کتب کے لئے پانچ ہزار روپے کی گرانٹ اُس زمانے میں دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب ہمارا دور آیا اور کتب خانہ آصفیہ جب نئے پُل کے پاس بنا تو تو نواب بہادر یار جنگ نے، [illegible] اعلیٰحضرت سے کہہ کر ۵، ہزار روپے تک اس کا گرانٹ

منظور کرائے جس میں پچاس ہزار روپے صرف اردو، عربی، فارسی کتب کے لئے اور ۲۵، ہزار روپے انگریزی کتب کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ کتابوں کی وہ خریداری برابر جاری رہی۔ جس قدر بھی حیدر آباد کے نادر کتب خانے تھے وہ نواب بہادر یار جنگ کے توسط سے کتب خانہ آصفیہ کے لئے خریدے جاتے تھے"

تو یہ شان تھی کتب خانہ آصفیہ کی ۱۸۹۱ء میں یہ آصف جاہی دور کا یادگار مینار بن کر اُبھرا، حکومت آصفیہ کا عوامی کتب خانہ قرار پایا۔ نواب عماد الملک، مولوی چراغ علی اور مولوی محب حسین جیسے ذی علم حضرات کے ذاتی کتب خانے اٹھ کر اس عظیم الشان لائبریری میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں جن میں سولہ ہزار سے زیادہ قلمی نسخے تھے اور قلمی نسخے بھی ایسے کہ ان میں قطب شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی دور کے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف بھری پڑی تھیں، غالبؔ اور میرؔ کی تحریریں بھی ملتی تھیں اور عربی، فارسی اور اردو کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس کی کتابیں کتب خانہ آصفیہ کی الماریوں میں موتی کی طرح جھلملاتی نہ ہوں۔

آج بھی اس کتب خانے کی شاندار عمارت کے گنبد اور محرابیں سامنے بہتے ہوئے دریا میں اپنا عکس دیکھا کرتے ہیں۔ وہ نہیں بدلے البتہ اُن کا نام بدل گیا۔ آصف جاہی دور کی یہ یادگار اب آندھرا پردیش کی اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کہلاتی ہے۔

میں وہاں گیا تو ذہن کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ یقیناً بہت بڑا کتب خانہ تھا مگر نئے حالات نے اُسے ویسا نہ رکھا جیسا میں نے سوچا تھا۔ آندھرا پردیش اب پانچ زبانوں کا سنگم ہے اور چونکہ یہ ریاست کی مرکزی لائبریری ہے اس لئے اس میں پانچوں کا بسیرا ہے۔ میری نگاہیں اردو، فارسی اور عربی کتابیں تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے کتب خانے کے عملے سے کہا کہ کچھ کتابیں لاکر دکھا دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ کتابیں باہر لانے کی ضرورت نہیں، نئے رواجوں کے مطابق آپ خود کتابوں کی الماریوں کے پاس جا سکتے ہیں اور جو کتاب چاہیں نکال کر دیکھ سکتے ہیں۔

اور پھر میری درخواست پر انہوں نے مجھے اُس بڑے کمرے میں پہنچا دیا جہاں لوہے کی قدیم

الماریوں میں اُردو، فارسی اور عربی کی کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔ کہیں دور ریلوے اسٹیشنوں کے غسلخانے جیسا مدھم سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور کتابیں کچھ اس طرح سو رہی تھیں کہ میں ان کے سرہانے بولا تو اس بات کا بہت خیال رکھا کہ آہستہ بولوں۔

میں نے کتب خانے کے ایک نگران، جناب عبدالقادر صاحب سے پوچھا کہ یہ کسمپرسی کا عالم کیوں ہے، ایک یتیمی سی کیوں نظر آتی ہے، تو کہنے لگے۔

"یہاں عربی، فارسی اور اردو کی بہت پرانی اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ بعض تو دو دو سو سال پرانی ہیں لیکن یہاں عربی، فارسی کا کوئی قابل آدمی نہیں ہے کہ اس شعبے کی نگہداشت کرے۔ حکومت چاہتی ہے کہ کوئی تقرر ہو لیکن عربی جاننے والے لوگ آجکل عرب ملکوں کو آسانی سے چلے جا رہے ہیں جہاں زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں۔ یہاں سرکاری تنخواہیں کم ہیں اس واسطے اس کا صحیح انتظام نہیں ہو سکا۔"

یہ تو ہوا چھپی ہوئی کتابوں کا احوال، وہ جو ہاتھ سے لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں تھیں جن کی وجہ سے کتب خانہ آصفیہ مشہور تھا۔ وہ کیا ہوئیں؟ پتہ چلا کہ وہ اسٹیٹ آرکائیوز میں منتقل کر دی گئی ہیں۔

مگر کیوں؟

کسی نے کہا کہ اچھا ہی ہوا۔ وہ بہت ہی نادر اور بیش قیمت مخطوطے تھے۔ یہاں ان کی حفاظت اور دیکھ بھال ممکن نہ تھی لہٰذا انہیں اب اسٹیٹ آرکائیوز کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں وہ تحقیق کرنے والوں کو دستیاب ہیں۔

تب پتہ چلا کہ کتب خانہ آصفیہ عرف اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی کتابوں پر سب سے بڑا ظلم دیمک، کیڑوں، خاک، دھول، اندھیرے اور سیلن نے نہیں بلکہ ہم نے، آپ نے، پڑھنے والوں نے، محققوں نے اور طالب علموں نے کیا۔ غضب یہ ہوا کہ الماریاں پڑھنے والوں کے لئے کھول دی گئیں۔ قارئین کو کتابوں تک رسائی کی اجازت دیدی گئی۔

پہلے لوگ کاغذ قلم لے کر آتے تھے اور نوٹس بنا کر گھر لے جاتے تھے۔ اب وہ بلیڈ اور قینچیاں لے کر آنے لگے اور پرانی پرانی نایاب کتابوں کے تمام مطلوبہ صفحے کاٹ کاٹ کر لے جانے لگے بعض لوگ اپنے ظرف کے مطابق مطلوبہ صفحے نہیں بلکہ پوری پوری کتابیں لے گئے۔ اس پر ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بات یاد آگئی۔

" ایک اور لائبریری ہے جو اس وقت، میں کہوں گا کہ بہت ہی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی ہے، حیدر آباد میں ہے اور بہت ہی اہمیت کی لائبریری ہے، وہ ہے آصفیہ لائبریری اور اس کے ذخیرے کے بارے میں آئے دن خبریں آتی ہیں کہ وہ خورد برد ہو رہا ہے۔"

ہم نے تصدیق کے لئے کتب خانے کے نگران عبدالقادر صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ کتابوں کے ورق غائب ہو جاتے ہیں اور چور اب اتنے دلاور ہو گئے ہیں کہ پوری پوری کتابیں آستینوں میں چھپا کر اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔

" یہ مرض تو عام ہے۔ آپ کو ہر لائبریری میں یہ شکایت ملے گی۔ لیکن اصل بیماری یہ نیا نظام اوپن ایکسس سسٹم ہے جس میں ہر ریڈر جا کر شیلف سے اپنی کتاب خود نکال سکتا ہے ہمارے لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں کہ کتابوں کی اہمیت کو محسوس کریں چنانچہ یہ مسئلہ ہر لائبریری میں ہے۔ یہاں بھی کافی چوریاں ہوتی ہیں اور کتابیں لاپتہ ہوتی ہیں ہزار کوشش کی جائے لیکن ہر قاری کے پیچھے ایک آدمی نہیں لگایا جا سکتا اور ہر ایک کو چور تو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ معاملہ ہمارے پاس بھی بہت تشویشناک ہے اور اس پر کیسے قابو پایا جائے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔"

آندھرا پردیش کی اس مرکزی لائبریری میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں مثلاً کتابوں کو کیڑوں مکوڑوں سے بچانے، موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے اور ان کی جلدیں باندھنے کا معقول انتظام ہے لیکن ایک بڑی خوبی ایسی ہے جس کے بہت جلد ختم ہو جانے کا خطرہ ہے۔

اس قدیم کتب خانے کے لئے پہلے دن، یعنی ۱۸۹۱ء سے اب تک اگر کوئی کاغذ بھی خریدا گیا ہے تو وہ ابھی تک رکھا ہوا ہے۔ کتنی ہی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے کاغذ اب اتنے خستہ ہو گئے ہیں کہ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتے ہیں، مگر لائبریری نے انہیں ابھی تک پھینکا نہیں ہے۔ ادھر اب یہ عمارت تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ نئی نئی کتابیں اور جریدے چلے آ رہے ہیں اور گنجائش نکالنے کے لئے پرانے ذخیروں کو تاحال سرکایا نہیں گیا ہے مگر یہ سلسلہ ہمیشہ نہیں چلے گا۔ وہ وقت شاید دور نہیں جب بعض پرانی کتابوں خصوصاً اخباروں، رسالوں اور جریدوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا، جیسا کہ عبدالقادر صاحب نے ہمیں بتایا۔

"اٹھارہ سو اکیانوے سے اب تک جو کچھ بھی اس لائبریری نے خریدا تھا اس کا ایک کاغذ بھی فروخت نہیں کیا گیا ہے لیکن اب جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک تجویز ہے کہ یہ مسئلہ کسی کمیٹی کے حوالے کیا جائے جو طے کرے کہ کس تاریخ تک کا مواد محفوظ کیا جائے اور کس تاریخ سے پہلے کا مواد ٹھکانے لگایا جائے۔ اس کا ابھی تصفیہ نہیں ہوا ہے اور جو بھی اخبار، رسالے اور کتابیں یہاں آئی ہیں ابھی تک نکالی نہیں گئی ہیں۔"

یہ وقت بہت کڑا ہے۔ کوئی اٹھے اور اخباروں، رسالوں اور جریدوں کے اس پرانے ذخیرے کو اپنی تحویل میں لے کر بچا لے ورنہ نئے دور کی تاریخ کے نہ معلوم کیسے کیسے گوشے ہمیشہ کیلئے تاریکی میں، یا پھر سامنے بہتی ہوئی موسیٰ ندی میں ڈوب جائیں گے۔

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے سولہ ہزار سے زیادہ قلمی نسخوں کی بات ہو رہی تھی جو اب اسٹیٹ آرکائیوز میں منتقل کر دیئے گئے ہیں چنانچہ ہم بھی اپنی گفتگو وہیں منتقل کرتے ہیں۔ یہ آصف جاہی دور کا 'دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب و مواہیرِ سرکار عالی، تھا جس میں دکن کے تاریخی ریکارڈ کی حفاظت کی جاتی تھی۔ آرکائیوز کے پہلے ناظم مولوی سید خورشید علی صاحب کی کوششوں سے وہاں تاریخی کتابوں کے لئے ایک کتب خانہ بھی قائم ہوا تھا اور ایسی کتابیں جمع کی گئی

تھیں جن میں ٹیپو سلطان کے زمانے کی تاریخ "فتح المجاہدین" کلیات علی عادل شاہ اور نورس نامہ جیسے نام آتے ہیں۔ اس ادارے میں جو دستاویزیں محفوظ ہیں ان کا احوال ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب نے سنایا جو اسٹیٹ آرکائیوز سے وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا۔

"آندھرا پردیش کے آرکائیوز میں دو کروڑ کاغذ تو صرف مغلوں کے ہیں اور ان کے علاوہ بہمنیوں کے، قطب شاہوں، بری شاہوں اور انگریزوں کے بہت سے کاغذ ہیں۔ قدیم ترین کاغذ اس دور کے ہیں جب تیمور زندہ تھا۔ اور فیروز شاہ بہمنی کا فرمان ۱۴۰۶ء کا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری ادارے میں محفوظ قدیم ترین کاغذ ہے۔"

کتب خانۂ آصفیہ کا ذخیرہ آجانے سے اسٹیٹ آرکائیوز کی لائبریری بہت بڑی دولت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مخطوطے یہاں محفوظ رہیں گے لیکن دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کتابیں پڑھنے والوں کو باآسانی مل جایا کریں اور دوسرے یہ کہ پڑھنے والے ان کا ادب اور احترام اسی طرح کریں جس طرح سعادت مند بچّے اپنے بزرگوں کی تکریم کرتے ہیں۔

ناخلف اولادوں نے اگر یہاں بھی قینچی اور بلیڈ کا استعمال کیا تو ہماری تہذیب کا دامن ہمیشہ کے لئے تار تار ہوجائے گا۔

دروازۂ خاور بند ہے

اُس روز ہم جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کی سیر کر رہے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، اور کتب خانہ اتنا بڑا ہے کہ اُسے دیکھنے اور اس کے رموز سمجھنے کے لئے سارا دن درکار تھا۔ ریفرنس اسسٹنٹ فاطمی صاحب ہمیں اپنے کتب خانے کا ایک ایک شعبہ دکھا رہے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ہمیں جلد فارغ کر دیں کیونکہ یہاں سے ہمیں دائرۃ المعارف بھی جانا ہے۔

دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن کا وہ شاندار ادارہ ہے جو بہت عرصے سے عربی علوم پر نہ صرف تحقیق کر رہا ہے بلکہ اِس دور میں بھی، جب برِصغیر سے عربی کا علم اٹھتا جا رہا ہے یہ دائرۃ المعارف اپنی تحقیق کی بنا پر آج تک نئی نئی کتابیں شائع کر رہا ہے۔

میں نے جو کہا کہ دائرۃ المعارف دیکھنا چاہتا ہوں، فاطمی صاحب بولے کہ آئیے، میں آپ کو دائرۃ المعارف دکھائے دیتا ہوں۔ مجھے ہمراہ لے کر وہ کتب خانے کے پچھلے حصے کی جانب چلے۔ میں سمجھا کہ کسی کھڑکی سے مجھے دائرۃ المعارف کی عمارت دکھا دیں گے، مگر سب سے

آخری الماری کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک خانے میں قرینے سے چُنی ہوئی تقریباً پچاس کتابیں دکھائیں جو بہت عمدہ حالت میں رکھی تھیں جیسے پڑھنے والوں نے ان کے ورق ہاتھوں سے نہیں بلکہ پلکوں سے پلٹے ہوں۔

کہنے لگے :۔ یہ ہے دائرۃ المعارف کی مطبوعات کا پورا سیٹ جو حیدر آباد دکن کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کے سب سے بڑے کتب خانے میں رکھا ہے لیکن آج تک ان کتابوں کو پڑھنے ایک شخص بھی نہیں آیا۔ نہ کسی نے یہ کتابیں دیکھنے کو مانگیں اور نہ گھر لے جانے کو جاری کرائیں۔ یہ ہے دائرۃ المعارف!

ہندوستان کے کتب خانوں کا المیہ یہ بھی ہے۔ عربی، فارسی کا علم اب بس تھوڑے دنوں کا مہمان ہے۔ اوپر سے غضب یہ کہ تاریخی کتب خانے عربی اور خاص طور پر فارسی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب پڑھنے والے نہیں رہیں گے تو پھر یہ کتابیں کیوں رہیں گی؟

جامعہ عثمانیہ میں بڑی روشن، کشادہ، جیتی جاگتی لائبریری ہے جس میں اب پونے چار لاکھ کتابیں ہیں۔ وہاں اردو، فارسی اور عربی کی چھپی ہوئی تین ہزار اور قلمی دو ہزار کتابیں موجود ہیں۔ لیکن وقت کی دوڑ میں یہ ذخیرہ اور یہ زبانیں اب دوسری زبانوں سے پیچھے رہی جاتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں یہ کتابیں تو ہیں مگر ان کے ہونے سے کبھی وہ جو اک رعنائی خیال تھی، وہ اب کہاں؟ جیسا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا۔

"عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا کردار، اورئینٹل اسٹڈیز اور علوم اسلامیہ کے معاملے میں یا اردو تحقیق کے معاملے میں اب وہ نہیں رہا جو مولوی عبدالحق کے زمانے میں ہوا کرتا تھا یا جس زمانے میں وہاں دارالترجمہ تھا جس میں وحید الدین سلیم تھے اور کسی زمانے میں علی بلگرامی تھے اور دوسرے حضرات تھے جنہوں نے کتنا مہتم بالشان کام کیا۔ ظاہر ہے کہ اب وہاں اردو کا ایک معمولی شعبہ ہے اور وہاں کتابوں کے ذخائر سے جتنا استفادہ ہو سکتا ہے

شاید نہیں ہو رہا ہے۔"

اور اب تذکرہ اُس عظیم الشان ذخیرے کا جو سالار جنگ میوزیم لائبریری کہلاتا ہے اور حیدرآباد دکن کی موسیٰ ندی کے کنارے محرابوں اور گنبدوں سے آراستہ ایک عمارت میں ہر اس شخص کے لئے کھلا ہے جسے علم کی جستجو ہے۔ یہ کتابیں حیدرآباد کے اُس گھرانے نے جمع کی تھیں جس کے ہونہار فرزند ریاست کے وزرائے اعظم مقرر ہوا کرتے تھے۔ سالار جنگ خانوادے نے سوا تین سو سال پہلے یہ قیمتی کتابیں جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ سالار جنگ اوّل میر تراب علی خاں نے اسے باضابطہ کتب خانے کی شکل دی، ان کے بیٹے میر لائق علی خاں نے اس میں دنیا کی نایاب کتابیں شامل کیں اور پھر ان کے پوتے میر یوسف علی خان، سالار جنگ سوئم نے اسے اتنی ترقی دی کہ لوگ انہی کو اس کتب خانے کا بانی کہتے ہیں۔

میر یوسف علی خاں صرف ۲۲ برس کی عمر میں ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم بنائے گئے مگر اس کام میں ان کا جی نہ لگا۔ صرف تین سال بعد وہ وزارتِ عظمیٰ چھوڑ کر اپنی دلچسپی کے میدان میں جا پہنچے۔ انہیں دنیا کے مختلف علاقوں میں سفر کرنے اور نایاب کتابیں، نادر چیزیں، جواہر اور تاریخی یادگاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے اپنے محل کو عجائب گھر بنا ڈالا اور ان کا یہ میوزیم اور ان کا یہ کتب خانہ آج بھی ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

کتب خانۂ سالار جنگ میں ہاتھ سے لکھی ہوئی عربی، فارسی، اردو اور ترکی کتابوں کی تعداد نو ہزار سے زیادہ ہے۔ یہاں صرف قرآن مجید کے تقریباً چار سو نسخے ایسے ہیں کہ اُن کی زیارت سے دل نہیں بھرتا۔ مغلوں سے پہلے کے، چودھویں صدی کے، خطِ گلزار میں لکھے ہوئے ایسے ایسے قرآن ہیں جن کے اوراق پر معلوم ہوتا ہے گلزار کھلے ہیں۔ ایک قرآن صرف پندرہ صفحوں پر مشتمل ہے اور اگرچہ باریک خط ہے مگر اتنا روشن ہے کہ باآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ کتب خانۂ سالار جنگ کے ذخیرے کی ایک اور دولت اس کے مصوّر نسخے ہیں جن میں گزرے وقتوں کی مصوّری کے شاہکار ہیں، مثلاً ایک کتاب کے بارے میں، جس پر کتب خانے کو بجا طور پر ناز ہے، وہاں کے مہتمم نے بتایا:

"مجالس العشاق صوفیا کا تذکرہ ہے۔ سلطان عذیر مرزا کا لکھا ہوا ہے مگر بابر نے تزک بابری میں لکھا ہے کہ کمال الدین حسین کا ہے جو علی شیر نوائی کے ہمعصر ہیں۔ اس میں پورے صوفیوں کی تصاویر کے ساتھ ان کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو ہم اصفہان اسکول سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ مگر شیراز کی اس پر بہت چھاپ ہے۔ ویسے تو صوفیائے کے کافی تذکرے ہیں اور مصور بھی ہیں لیکن مجالس العشاق سب سے اچھا ہے۔ اس کا ایک اَور نسخہ بھی ملتا ہے مگر اس میں بیس پچیس تصاویر ہیں جبکہ اس نسخے میں اکہتر ہیں۔ کتاب خلقتِ آدم سے شروع ہوتی ہے اور انبیاء کے تذکروں سے ہوتے ہوئے صوفیا تک پہنچتی ہے۔"

اسی طرح محمد قلی قطب شاہ کا دیوان ہے جس کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ملتا ہے جو کتب خانہ سالارِ جنگ میں محفوظ ہے۔ یہ دیوان سولہویں صدی کے آخر میں خود محمد قلی قطب شاہ کے دور میں لکھا گیا تھا۔ اس میں دس تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں۔ اتفاق سے اسی جلد میں عبداللہ قطب شاہ کا دیوان بھی بندھا ہے۔ پھر خمسہ نظامی ہے جو جہانگیر کے دور میں لکھی گئی۔ اس میں پانچ مثنویاں ہیں اور تصویریں بھی ہیں۔ اس قسم کے پانچ یادگار اور تاریخی مخطوطوں پر ایک جامع کتاب چھاپی جا رہی ہے جو کتب خانے کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بند ان نادر کتابوں اور تصویروں کو عام لوگوں کے گھروں تک پہنچا دے گی۔

اس کے علاوہ ایک اَور تاریخی کتاب عشیرۃ الاسلام چھپ رہی ہے۔ اس کتاب میں تمام اسلامی احکام جمع کئے گئے ہیں۔ یہ محمد بن ابی بکر سمرقندی کی تصنیف ہے جن کی وفات ۷۲۰ھ میں ہوئی تھی۔ دکن میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے، خیال ہے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

حیدر آباد کا ایک کتب خانہ دل کو بہت دکھاتا ہے۔ یہ نایاب کتابوں کا ایک ایسا چشمہ ہے جو خزاں کے پتّوں تلے چھپ گیا ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ علم کی پیاس بجھانے والے اب بھی پتّوں کو سرکا کر دو چار گھونٹ پی لیا کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ سعیدیہ ہے جو مدراس کے عظیم علمی

زیادہ نایاب قلمی کتابیں ہیں، اسلامی تاریخ اور دکنی تمدن پر بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ٹیپو سلطان اور لارڈ کلائیو کے ذاتی خط اور کئی شاہی فرمان محفوظ ہیں۔ بس اس کا المیہ یہ ہے کہ اتنے بڑے خزانے کی دیکھ بھال کرنا اب مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ کتب خانۂ سعیدیہ زیادہ تر بند رہتا ہے اگر اس کو دن کی روشنی اور تازہ ہوا نصیب نہ ہوئی تو یہ بے مثال دولت بھی وہیں پہنچ کر دم لے گی جہاں مفتی سعید مرحوم چین کی نیند سو رہے ہیں۔

خدا انہیں جنّت اور ان کی کتابوں کو نئی زندگی عطا کرے۔

حیدرآباد میں کتابوں کا ایک اور ذخیرہ جو اردو اور خصوصاً دکنی ادب کی تاریخ میں جگہ پائے گا اور وہ ہے ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ۔ اس کتب خانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف کتابیں ہی نہیں بلکہ ادب نوازوں اور علم دوستوں کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔

مخطوطات میں حضرت خواجہ بندہ نواز کا چکّی نامہ اور شیخ اشرف کی نو سرہار یہاں موجود ہے۔ برصغیر میں جب اردو کی نئی نئی طباعت شروع ہوئی اس وقت کی کتابیں ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہیں۔ پرانے اخباروں کے فائل ہیں ۱۸۱۴ء میں ہنری مارٹن اور مرزا فطرت نے انجیل کا جو اردو ترجمہ کیا تھا، وہ یہاں محفوظ ہے۔ مگر ان کتابوں میں، اس خون اور اس پسینے میں اب کچھ آنسو بھی شامل ہوا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا:

"اسے ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم و مغفور نے قائم کیا تھا، خدا انہیں جنّت نصیب کرے کیونکہ انہوں نے کوئی چار پانچ ہزار اردو، فارسی اور عربی مخطوطے اور اردو فارسی قدیم تذکرے اور دکنی ادبیات کے تمام پرانے دواوین، کلیات اور نثر کی داستانیں اور ایسی ہی کتابیں جمع کی تھیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے لئے انہوں نے ذاتی گرہ سے زمین خریدی، ادارہ بنایا، اُسے چلایا لیکن ان کی بے وقت موت سے اب اس ادارے میں وہ کام نہیں ہو رہا جو کسی زمانے

ہیں اس سے توقع کی جاتی تھی - چار پانچ جلدوں میں تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو چھپا ہوا ہے اور اس میں سب سے بڑا ذخیرہ قطب شاہی اور عادل شاہی زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ہے۔ ان کے علاوہ شاہی فرامین اور اس عہد کی تاریخی دستاویزات اور سرکاری، قانونی، عدالتی اور ریاست کے کاغذ وہاں محفوظ ہیں اور چونکہ اب وہاں نگرانی کا ٹھیک انتظام نہیں، اس سے استفادہ بھی کم ہوتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع نہیں اس لئے تشویش ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جب مہتمم ہی نہیں اور مالی حالت اچھی نہیں تو بہت سی چیزیں گم ہو رہی ہیں اور بہت سے ذخیرے کو دیمک کھا رہی ہے۔ تو نتیجہ اس کا کیا نکل سکتا ہے، اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔"

حیدر آباد دکن میں کتابوں کا ایک خزانہ ایسا ہے جو اگر دنیا کے سامنے آگیا تو دورِ حاضر کی آنکھیں چکا چوندھ ہو جائیں گی، اور وہ ہے نظام دکن، میر عثمان علی خان مرحوم کے خاندان کا کتب خانہ۔ یہ کتب خانہ آصف جاہ اوّل سے ورثے میں چلا آتا ہے اور اب نظام کی کنگ کوٹھی میں بند ہے۔

کسی کو خبر نہیں کہ اس میں کیسے کیسے جواہر پارے بند ہیں۔ میر عثمان علی خان مرحوم کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ جس کتب خانے میں جاتے تھے وہاں کی بہترین کتابیں "عاریتاً" لے آتے تھے۔ اور پھر اُن کتابوں کو واپس جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔

ان کے کتب خانے میں کیا کیا نہیں چھپا ہوگا۔ مگر وہ چونکہ بند ہے اس لئے قیاس آرائیوں اور افواہ طرازیوں کے دروازے کھلے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ بتاتا ہے۔

مگر ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے وہ سب جھوٹ ہو۔

ہم سوچتے ہیں کہ جس روز کنگ کوٹھی کا کتب خانہ کھلے گا، اُس روز دروازۂ خاور کھلے گا۔ ہم کتنے نادان ہیں۔ کیسی کیسی باتوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔

کتابوں سے بھرے گھر

ہوا یہ کہ میں نے کراچی میں مرزا ظفرالحسن کو خط لکھا اور پوچھا کہ آپ ابنِ انشاؔ لائبریری کھول رہے تھے، اُس کا کیا بنا؟

جواب آیا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔

مطلب یہ کہ بہت دوڑ دھوپ کی، بڑی درخواستیں دیں، کچھ اَور کھول رہے ہوتے تو کبھی کا کھل گیا ہوتا مگر چونکہ لائبریری کھولنا چاہتے تھے، ارباب اختیار کے ایک کان سے دوسرے تک ایک سوراخ کھل گیا۔

ابنِ انشاء جیسے شخص کا نام وابستہ ہوا بھی تو نارتھ ناظم آباد کی ایک چھوٹی سی سڑک سے اور سننے میں آتا ہے کہ لوگ اس کا نام مٹا ڈالنے پر تُلے ہوتے ہیں۔

کراچی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کتابوں کی کتنی بڑی دولت پورے برِصغیر سے سمٹ کر وہاں پہنچی ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ کون سے خستہ حال مکان میں کیسے کیسے نادر نسخے آج تک اپنے محسنوں کے منتظر ہیں لیکن شاید اب اس شہر کے نصیب میں کوئی دوسرا ممتاز حسن

نہیں۔ جس طرح دلّی کے حصے میں حکیم عبدالحمید آئے، یہ بٹوارہ کراچی کو کوئی ایسی شخصیت نہ دے سکا کہ کتابیں جس کا دم بھریں۔ کچھ ایسی ہی بات ایک روز مشفق خواجہ نے کہی۔

"پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے جو لوگ آئے وہ اپنے ساتھ مخطوطات بھی لے کر آئے اور یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ حکومت پاکستان نے نیشنل میوزیم کے لئے ان مخطوطات کی خریداری کی اور ممتاز حسن مرحوم خاص طور پر اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تو اس وقت نیشنل میوزیم میں تقریباً نو ہزار مخطوطات ہیں اور جن میں سے بہت سے مخطوطات منحصر بہ فرد ہیں، یعنی ان کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں، اسی طرح مولوی عبدالحق جب آئے تو وہ انجمن ترقی اردو کی لائبریری کے مخطوطات کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیتے آئے اور وہ بھی بہت نادر ذخیرہ ہے، خصوصاً دکنیات سے متعلق کتابیں اس میں بہت ہیں۔ یہ چیزیں اب بھی نیشنل میوزیم میں ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ کراچی کا نیشنل میوزیم کتابوں کی بہت بڑی دولت سے مالامال ہے۔ وہاں ابوبکر محمد کی التصرف فی التصوف محفوظ ہے جو ۷۴۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ اذکار امام نودی کا فارسی ترجمہ ہے جس پر شہنشاہ اکبر کی والدہ حمیدہ بیگم کی مُہر موجود ہے۔ تیرھویں صدی کی کلیّات ناسخ ہے۔ عطار کی منطق الطیر ہے جو اکبر کے شاہی کتب خانے سے چل کر کراچی کے قومی عجائب گھر میں پہنچی ہے۔

یہ تو خیر وہ کتابیں جو شوکیس میں سجی ہیں لیکن اصل ذخیرہ اندر کہیں ہے۔ میں اسے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ میں نیشنل میوزیم پہنچا اور یہ نو ہزار مخطوطے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جواب ملا کہ لائبریرین صاحب دستیاب نہیں اس لئے داخلہ بھی ممکن نہیں۔ ان کتابوں کی حالت جاننے والے بعض علم دوستوں نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ یہی جواب ملے گا۔

اچھا تو اب کیا صورتِ حال ہے؟ کیا اب ۲۰۰۰ء کی دہائی میں بھی پُرانی کتابیں اسی طرح

خریدی جا رہی ہیں؟ مشفق خواجہ نے کہا:

"ہمارے ہاں مخطوطات کی خریداری کے سلسلے میں کوئی دلچسپی کسی کو نہیں ہے، جتنا بھی کام ہوا ہے ایک فرد کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے، اور وہ تھے مرحوم ممتاز حسن۔ وہ مر گئے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔"

کراچی میں قدیم اور نادر کتابوں کے ذاتی ذخیرے کتنے لوگوں کے پاس ہیں، انہیں شمار کرنا مشکل اور ان کی فہرست بنانا ناممکن ہے، مگر جن کو ہم جانتے ہیں ان کی گفتگو ذرا دیر بعد ہو گی۔ پہلے آیئے بحرِ عرب کے ساحل سے ضلع دادو کی پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے اس شہر کے بڑے کتب خانوں کی بات کریں۔

کراچی میں کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری میں ہے۔ وہاں موجود کتابوں کی تعداد اب ڈھائی لاکھ ہوا چاہتی ہے۔ پھر لیاقت میموریل لائبریری ہے جہاں یوں تو ایک لاکھ لیکن مشرقی علوم کی تیس ہزار کتابیں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص اور کتب خانۂ عام میں ایسا ذخیرہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی، پھر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا اپنا کتب خانہ ہے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اپنی لائبریری ہے جو بہت گراں قدر ہے۔ اس کے علاوہ اہلِ علم حضرات نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور نیشنل بینک میں کتب خانوں کے پودے لگائے تھے جو اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ خالق دینا ہال کی لائبریری بہت قدیم تھی، تھیوسوفیکل ہال کا ذخیرہ بھی بہت پرانا تھا، شاید اب بھی ہو گا۔ سنٹرل سیکرٹریٹ کی لائبریری، صدر میں نہایت عمدہ اور موزوں مقام پر اتنی ہی نفیس عمارت میں ہوا کرتی تھی، نہ معلوم کس کے جی میں کیا آئی، اُسے اٹھا کر شہید ملت روڈ کے بازار کی بالائی منزل میں بٹھا دیا، اب وہاں کوئی تماشائی تک نہیں آتا۔ باغ جناح کی لیاقت ہال لائبریری جو ۱۸۵۲ء کی فریئر ہال لائبریری کی ورثے دار ہے، کہتے ہیں کہ اب خوب نکھر رہی ہے۔

دو تازہ کتب خانوں نے کراچی میں علم کے چراغ جلائے ہیں۔ اس دور میں جب بڑے

بڑے نئے نئے کتب خانے کھولنے کے لئے آدمی یا تو صاحبِ ثروت ہو یا سرپھرا ہو، کراچی شہر کو دو نئے کتب خانے کھلنے کا شرف ملا ہے۔

ان میں سے ایک غالب لائبریری ہے جس کو اب چشم بد دور بارہواں برس لگا ہے۔ اس کی نچلی منزل میں اگرچہ بینک ہے مگر اس کی بنیادوں میں مرزا ظفر الحسن کا گاڑھا پسینہ ہے۔ غالب لائبریری میں ادبی موضوعات پر پندرہ ہزار کتابیں جمع کی جا چکی ہیں جن میں ایک ہزار سے زیادہ کتابیں نادر، نایاب اور کمیاب ہیں۔ اسی طرح رسالوں کی تعداد پچاس ہزار ہے جن میں سے بعض ستّر اسّی سال پرانے ہیں۔ رسالوں کے خاص نمبر جمع کرنے میں غالب لائبریری کو ملکہ حاصل ہے۔ چنانچہ غزل نمبر، ناول نمبر، آپ بیتی نمبر وغیرہ اتنے بہت سے ہیں کہ کسی نے ٹھیک ہی کہا کہ اس معاملے میں یہ بہت نمبری لائبری ہے۔

غالب لائبریری کے دو شعبے بہت دلچسپ ہیں۔ ایک میں ممتاز ادیبوں کے خطوط محفوظ کئے جا رہے ہیں اور دوسرے میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ڈرامے جمع ہو رہے ہیں جو اتنے بہت سے ہیں کہ مستقبل کا محقق تنگ آجائے گا تحقیق کرتے کرتے۔

کراچی کا دوسرا نیا کتب خانہ ہمدرد لائبریری ہے جو ناظم آباد میں ہمدرد فاؤنڈیشن کی عمارت کے وسیع ہال میں قائم کی گئی ہے اور لائبریری کے جدید اصول پر ترتیب دی گئی ہے۔ کسی نے گلہ کیا کہ وہاں ہر قسم کی کتابیں بھر لی گئی ہیں لیکن یوں نہیں ہے۔ اگرچہ حوالے کے لئے ہر موضوع کی نمائندگی ہے لیکن ہمدرد لائبریری اسلامیات، طب، سائنس، عمرانیات، ادب اور تاریخ و سوانح کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں تقریباً سات سو مخطوطے ہیں اور قلمی نسخوں اور نادر کتابوں کی خریداری کا سلسلہ جاری ہے۔

ہمدرد لائبریری میں ایک شعبہ ایسا ہے جس میں قرآن مجید کے ترجمے، جو دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہوتے رہے ہیں، جمع کئے جا رہے ہیں۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کی طرح ہمدرد لائبریری ایک اور دلچسپ کام یہ کر رہی ہے کہ مصنفوں کی کتابوں کے اصل مسودے اپنے ہاں محفوظ کر رہی

ہے جو تحقیق میں بہت کام آئیں گے۔

اور اب ہم آتے ہیں کراچی کے ذاتی کتب خانوں کی طرف، یہاں سے میری گفتگو میں افتخار عارف بھی شریک ہیں جنہوں نے علم کی جستجو میں سینکڑوں دروازے جھانکے ہیں۔ انہوں نے کہا:

"ادبی کتابوں کا جو ذخیرہ میری نظر سے گزرا ہے کہ جہاں جا کر انسان کا جی چاہتا ہے کہ بیٹھا رہے، وہ مشفق خواجہ صاحب کا ذخیرہ ہے۔ وہ نہایت حلیم الطبع ہیں۔ اور ہمارے بزرگ، دوست اور کرم فرما بھی ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کے پاس بے انتہا اچھا اور منتخب ذخیرہ ہے۔ کیونکہ وہ خود محقق ہیں اور ورثہ دار ہیں ایک بڑے محقق کے، ان کا کتب خانہ دیکھنے کے قابل ہے، یگانہ کی بہت سی چیزیں ان کے پاس جمع ہیں۔"

کراچی میں کتابوں کا جو ذخیرہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے وہ برصغیر کے سرکردہ عالم اور محقق سید محمد بیدری صاحب کے نام نامی سے منسوب ہے۔ اس کا بڑا حصہ وہ اپنے ہمراہ ہندوستان سے لے آئے تھے۔ اردو کے استاد پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے بھی نادر کتابوں کا بڑا ذخیرہ کیا اور کتنی ہی کتابیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کیں۔

افتخار عارف نے کہا: "خالد اسحاق صاحب کا نام ہمارے بہت مشہور قانون دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اسلامی کتاب ایسی نہیں جو دنیا میں کہیں چھپی ہو اور وہ ان کے پاس موجود نہ ہو خاص طور پر حدیث، تاریخ اور فقہ پر جتنا اچھا انتخاب خالد اسحاق صاحب کے ہاں ملے گا وہ ذرا کم کم دیکھنے میں آئے گا۔"

سندھ کے بہت بڑے عالم دین حضرت مولانا دین محمد وفائی صاحب کا عظیم الشان کتب خانہ تھا، وہ اب ان کے ورثا کے پاس ہے۔ علی نواز وفائی صاحب کے پاس بھی اچھا ذخیرہ ہے۔ جی الانہ صاحب بہت ابتدائی دنوں میں، جب قلمی نسخوں کی قدر نہ تھی، سندھ کے دور دراز

علاقوں میں جا کر مخطوطے خریدتے تھے، الآنہ صاحب کا ذاتی کتب خانہ بہت موقر اور معتبر ہے۔ پیر حسام الدین راشدی مرحوم کا کتب خانہ یوں شاندار تھا کہ کتابوں کا بڑا ورثہ تو خاندان میں چلتا ہوا ان تک پہنچا، اور خود انہوں نے بھی بے شمار کتابیں جمع کیں۔ اسی طرح پیر علی محمد راشدی صاحب کا کتب خانہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کریم بخش خالد صاحب بھی شاندار کتابوں کے ذخیرے کے مالک ہیں۔

افتخار عارف نے کہا "مجھے حضرت علاّمہ رشید ترابی اعلیٰ مقامہٗ کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نہایت عُمدہ، بہت منتخب اسلامی تاریخ کا کتب خانہ تھا۔ پھر فلسفے پر کتابیں الگ۔ اُن کو ادبیات سے بھی بہت شغف تھا، اس کی الگ کتابیں۔ اُن کے پاس بڑا عُمدہ انتخاب تھا۔"

اسی نوعیت کی کتابیں حضرت مولانا مصطفیٰ جوہر صاحب کے کتب خانے میں ہیں۔ حضرت مولانا مہدی پویا صاحب، مولانا یوسف بنّوری صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا شمار اکابرین میں ہوتا ہے۔ ان سب کے ذاتی ذخیرے تھے۔ عربی ادب کے دورِ حاضر کے سب سے بڑے علماء میں ہمارے علاّمہ عبدالعزیز میمنی صاحب سرِ فہرست ہیں۔ ان کا بہت عظیم الشان کُتب خانہ تھا۔ اسی طرح علاّمہ خلیل عرب بھی بڑے بھاری کتب خانے کے مالک تھے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ذاتی ذخیرہ ایسا ہے کہ محقق اُس میں نہ جائے تو تحقیق کے کتنے ہی گوشے تاریک رہ جائیں۔

افتخار عارف نے کہا "پھر ایک اور سلسلہ ہے، جیسے ہمارے حکیم نصیر الدین صاحب اور محمود احمد برکاتی صاحب۔ یہ دو بزرگ ایسے ہیں جن کے ہاں نہ صرف طب پر بلکہ فلسفے پر بھی بہت سی کتابیں مل جائیں گی۔ خاص طور پر بیدلؔ پر جتنا ذخیرہ آپ کو مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب اور حکیم نصیر الدین صاحب کے ہاں ملے گا، وہ میں نہیں سمجھتا کہ برصغیر میں اور کسی فردِ واحد کے پاس ملے۔"

اسی طرح حکیم محمد سعید صاحب کے پاس بے مثال ذخیرہ تھا۔ شان الحق حقّی صاحب اور

حفیظ ہوشیارپوری صاحب کے پاس بھی اچھے کتب خانے ہیں مگر بہت ہی نادر اور عظیم ذخیرہ جمیل جالبی صاحب کے پاس ہے جو اپنی تاریخِ ادب اُردو کے لئے متواتر تحقیق کر رہے ہیں۔
تحقیق کے میدان میں مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ صوفیائے کرام پر ان کی زبردست ریسرچ ہے اور اسی مناسبت سے ان کا ذاتی کتب خانہ قابلِ منزلت ہے۔
حیدرآباد دکن سے جو کتابیں پاکستان منتقل ہوئیں، شہر میں ان کے بہت سے ذخیرے ہوں گے لیکن ایک نہایت اچھا ذخیرہ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے نارتھ ناظم آباد میں ایوان اُردو قائم کر کے اپنی علم پروری اور اردو نوازی کا ایوان آباد کر رکھا ہے۔ ایوان اردو کے کتب خانے میں کتنے ہی فارسی، عربی اور اردو مخطوطے آراستہ ہیں لیکن دکنی مخطوطوں اور مطبوعات کا نہایت نادر ذخیرہ ہے۔ وہاں دکنی مطبوعات کی تعداد پندرہ سو سے زیادہ ہے، رسائل تقریباً ۱۴۰۰ ہیں اور دوسری مطبوعات پانچ ہزار سے کم نہیں۔
کتابیں جمع کرنے والوں کی فہرست یوں تو بہت طویل بنے گی لیکن اُن میں عبدالرؤف عروج، مسلم ضیائی اور عمر مہاجر صاحب کے پاس اچھے ذخیرے ہیں۔ ملیح آباد کے ڈاکٹر نفسل عظیم صاحب کے پاس مخطوطوں کا خاصا بڑا مجموعہ ہے جو انہوں نے بہت حفاظت اور احتیاط سے رکھا ہے۔
کتابوں کا سودا جس کے سر میں سما جائے پھر اُسے چین سے بیٹھے کبھی نہیں دیکھا۔ کراچی کے کتب خانوں کی گفتگو ہم ایسی ہی ایک شخصیت کے ذکر پر ختم کرتے ہیں۔ ان کا احوال افتخار عارف نے کچھ یوں کہہ سنایا۔

"میرے ایک دوست ہیں مدبر رضوی۔ وہ پاکستان ٹیلیویژن، کراچی کے اسکرپٹ ایڈیٹر ہیں لیکن اُن کا اصل جوہر یہ ہے کہ دُنیا زمانے کی نایاب کتابیں جمع کرتے ہیں۔ مجھے ان کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بس جتنی جگہ پر وہ بیٹھ جاتے ہیں یا لیٹ جاتے ہیں، اتنی جگہ تو خالی ہے، بقیہ میں کتابیں چُنی ہوئی

ہیں۔ کتابوں کو وہ تکیئے کے طور پر بھی اور بستر کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں اور کیا عجب کہ بیساکھیوں کے طور پر بھی استعمال کرتے ہوں۔"

جہاں نگاہ نہیں جاتی

کتابوں کی تلاش اب ہمیں ایک ایسے خطّے میں لئے چلتی ہے جہاں عام لوگوں کی نگاہ بھی نہیں جاتی۔

بہاولپور کے بارے میں سنا کرتے ہیں کہ ریاست کے زمانے میں اس کا نقشہ بالکل عراق جیسا تھا۔ وہاں عراق سے لاکر کھجور اگائی گئی تھی یہاں تک کہ ریاست کا دارالخلافہ بغداد الجدید کہلایا جانے لگا۔ اُس قدیم بغداد اور اس جدید بغداد میں یکسانیت صرف نقشے اور کھجوروں ہی کی نہیں تھی بلکہ ایک دولت اور بھی تھی جس پر اُس بغداد کو بھی ناز تھا اور اِس بغداد کو بھی۔ اور وہ تھی علم کے جواہر پاروں کی دولت، ایسی ایسی کتابوں کی دولت جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ تھا اور وہ بھی اسی بہاولپور کی سرزمین پر۔

اوچ شریف کا نام ہم نے پہلے پہل مزاروں، گدّیوں اور خانقاہوں کے باعث سنا تھا، پھر تاریخ میں بارہا اس کا ذکر آیا۔ کس طرح دارا شکوہ بھاگتا ہوا اوچ پہنچا تھا اور کس طرح اورنگ زیب کی فوجیں اس کی بو سونگھتی وہاں پہنچی تھیں۔ پھر کسی نے بتایا کہ شہر اوچ

کو تاریخ میں فضیلت یوں بھی حاصل ہے کہ خاندان بنی ہاشم کے کتنے ہی افراد حجاز، عراق اور ایران چھوڑ کر اوچ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ گیارہویں امام حضرت حسن عسکریؒ بخارا چھوڑ کر ہندوستان تشریف لائے اور اوچ میں قیام فرمایا۔ مگر کتابیں ایسی روایتوں سے بھری پڑی ہیں جن کی نہ کہیں سند ملتی ہے اور نہ کہیں تصدیق ہوتی ہے۔

اس باب میں ہم اس سرزمین میں چھپے ہوئے کتب خانوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ان میں نئے، پرانے سرکاری، نیم سرکاری، ذاتی اور نجی، ہر قسم کے کتب خانے شامل ہیں۔

بہاولپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد جناب اسلم ادیب ان دنوں برطانیہ میں تحقیق اور مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں دعوت دی کہ بہاولپور کے تاریخی اور علمی پس منظر کے حوالے سے وہاں کی کتابوں کے بارے میں اور کتب خانوں کے متعلق بتائیں۔ باقی احوال اُنہی کی زبانی ہے:

بہاولپور کے کتب خانوں کی اہمیت خود بہاولپور کے تاریخی اور ادبی پس منظر سے بنتی ہے۔ وہاں ادب اور تحقیق کی قدیم روایت موجود ہے۔ ریاست ہونے کی وجہ سے اہل علم کو حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی اور دوسرے یہ کہ خواجہ فریدؒ کی سرزمین ہونے کی وجہ سے اس میں ادب کی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب علم و ادب پروان چڑھا تو وہاں ایک کتب خانہ بھی پھلا پھولا جس کا پنجاب کے چند بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور وہ ہے بہاولپور کی سنٹرل لائبریری۔ اس کی تو بہر حال سرکاری نوعیت ہے لیکن نجی اور خاندانی کتب خانوں میں جو سرِ فہرست آتا ہے وہ ہے اوچ شریف میں گیلانی خاندان کی لائبریری۔ اس کے علاوہ کچھ اور نجی کتب خانے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

سنٹرل لائبریری جون ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت وہ اپنے ذخیرۂ کتب کی وجہ سے بڑی منفرد ہو گئی ہے۔ اس میں اسّی ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جن کے مختلف موضوعات ہیں یعنی فلسفہ، ادب، تاریخ، سیاست اور مغربی اور مشرقی علوم۔

یہ لائبریری اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس کا ایک گشتی شعبہ بھی ہے جو قارئین کو خود ان کے علاقے میں پہنچ کر کتابیں فراہم کرتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے کچھ پرانے رسائل کی تلاش تھی۔ دوسرے مقامات پر ناکامی کے بعد میں بہاولپور کی سنٹرل لائبریری پہنچا تو دیکھا کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کی فائلیں موجود تھیں جن میں صرف رسالے ہی نہیں بلکہ اخبارات بھی شامل ہیں۔

سنٹرل لائبریری میں قلمی نسخے بھی ہیں جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے بعض چوتھی صدی ہجری میں لکھے گئے تھے۔ وہاں کئی ہندو شعراء کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیوان موجود ہیں۔ مشکوٰۃ شریف کا ایک نادر قلمی نسخہ وہاں رکھا ہے۔ بالخصوص تصوّف پر لکھے جانے والے سالوں کے کئی قلمی نسخے وہاں ملتے ہیں۔

قدیم ذخیروں میں اوچ گیلانی کا کتب خانہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں ہمیں قدیم ترین اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس کتب خانے میں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف، فلسفہ، شعروادب، تذکرہ نگاری اور مصوری کا نہایت بیش قیمت خزانہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ موضوعات ایسے بھی ہیں جو عام کتب خانوں میں نہیں ملتے، مثلاً موسیقی، سیاہ گری، شکاریات، روحانی عملیات، نجوم، آثارِ قدیمہ، حتیٰ کہ گھوڑوں کی مختلف اقسام پر بھی کافی تعداد میں کتابیں وہاں ملتی ہیں۔

اوچ شریف کے اس ذخیرے کی جو کتابیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ان میں خط کوفی میں قرآن پاک کے کچھ اجزاء ہیں جو ہرن کی کھال پر لکھے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے دستِ مبارک سے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ بات تحقیق طلب ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اوچ شریف میں موجود قدیم ترین مخطوطہ ہے۔

اس کے علاوہ تیسری صدی ہجری اور آٹھویں صدی ہجری کے درمیان لکھی جانے والی مذہب، تصوّف اور ادب کے موضوع پر مثنویاں اور رسائل ایسے ہیں جن کے نسخے کہیں اور نہیں ملتے۔ بالخصوص حضرت عبدالقادر جیلانی کے حالاتِ زندگی اور فضائل پر کئی اہم کتابیں موجود ہیں جن کے مصنفوں اور کاتبوں کے ناموں کا علم نہیں۔

اسی طرح وہاں شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت یادداشتوں کا قلمی نسخہ، اقبال نامۂ جہانگیری بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا سفرنامہ مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ علی قلی خاں کا تذکرہ ریاض الشعرا بھی قابل ذکر ہے، جس میں تقریباً ہزار شعرا کا احوال درج ہے۔

قدیم یونانی طِب کے موضوع پر اوچ شریف میں کئی قلمی نسخے ملتے ہیں جو اہمیت کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر مخطوطہ ایک ہندو شاعر سائیں ولی رام کا ہے جس نے ایک مثنوی لکھی ہے جو اسلامی تصوّف کے چھ مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

اوچ شریف میں قلمی تصویروں کا ذخیرہ بھی ہے جو تحقیق طلب ہے۔ اس میں مختلف اہم شخصیات کے پورٹریٹ شامل ہیں اور کتنے ہی بادشاہوں، شہزادوں، بزرگانِ دین اور شعرا کی شبیہیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اُن کا مصوّر کون ہے۔ بیشتر تصویروں کی یہ صورتِ حال ہے۔

لیکن اوچ شریف کا یہ ذخیرہ اطمینان بخش حالت میں نہیں ہے۔ اسے بھاری سرپرستی، امداد اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ جو کتابیں بچ رہی ہیں انہیں محفوظ کر لیا جائے۔ اس کتب خانے کا ایک کیٹلاگ تیار ہوا تھا جو ابھی تک دستیاب ہے۔ اسکے دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اوچ شریف کے ذخیرے کی کتنی ہی کتابیں صفحۂ ہستی سے مِٹ چکی ہیں۔

بہاولپور میں تیسرا بڑا اور قابلِ ذکر کتب خانہ، مبارک اُردو کتب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتب خانہ محمد آباد، شجر پور کے علاقے میں ہے اور یہ ۱۹۲۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور نیاز فتحپوری کے مشورے سے قائم ہوا تھا۔ اس میں بہت سی نادر اور کمیاب کتابیں محفوظ ہیں۔ اسی طرح شہر فقیروالی کے مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کے کتب خانے میں بہت اچھا ذخیرۂ کتب ہے۔

ایک اور کُتب خانہ، جو مذہب اور تصوّف کے لئے مخصوص ہے، حضرت شیخ الجامعہ لائبریری کہلاتا ہے۔ یہ کتب خانہ شیخ الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی مرحوم کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ اس میں مذہب، تصوف، تفسیر اور تاریخ کی قدیم کتب اور رسائل ملتے ہیں۔

بہاولپور کی سرزمین مقامی بولی یعنی سرائیکی کے ادب سے مالا مال ہے۔ وہاں کی ایک نامور سماجی شخصیت ہیں سیٹھ عبدالرحمٰن، ان کا ایک کتب خانہ ہے جس میں تقریباً نو ہزار کتب پائی جاتی ہیں جن کا ایک تہائی حصہ سرائیکی ادب پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرائیکی ادب جتنا بھی تخلیق ہوا ہے انہوں نے وہاں اکٹھا کر لیا ہے، کیونکہ سرائیکی ادب سے انہیں خصوصی ذوق اور لگاؤ ہے۔

بہاولپور کی ایک اور ادب نواز شخصیت ہیں طاہر محمود کُریجہ۔ سیدانی شریف میں ان کا کتب خانہ ہے جنہیں تقریباً گیارہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اُن کے موضوعات میں ادب، تاریخ، مذہب اور سائنس ہیں۔

اس خطے کی اہم ادبی اور علمی شخصیتوں میں شہاب دہلوی شامل ہیں۔ مجلّہ الزبیر کے ایڈیٹر ہیں اور برِّصغیر کے کتب خانوں پر خصوصی نمبر شائع کر چکے ہیں، جو اس موضوع پر ملنے والی گنی چنی دستاویزات میں اہم اضافہ ہے۔ ان کے پاس بھی کتب کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے جس میں کئی مخطوطے قابلِ ذکر ہیں، مثلاً ایک فارسی دیوان ہے جس کے مصنف اور دور کا تعین ہونا باقی ہے۔ اسی طرح ایک قدیم قلمی نسخہ سنسکرت میں ہے جس میں بادشاہوں کے عشق کی داستانیں ہیں اور جا بجا فارسی اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کی تفصیلات بھی تحقیق طلب ہیں۔

اِک تیر مرے سینے پہ

کتابوں کا یہ سفر اب ہمیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے دو خطّوں میں لئے چلتا ہے. ایک وہ خطّہ جہاں گھر گھر اُردو، فارسی اور عربی کا چرچا تھا مگر وہاں کتابوں کے کتنے ہی بڑے بڑے خزانے وقت کے ہاتھوں لُٹ گئے اور وہ ہے بہار۔

اور دوسرا وہ خطّہ جہاں عربی فارسی کا خاتمہ ہوا اور اردو برائے نام ہے مگر جہاں ان زبانوں کی کتابیں اب بھی یوں رکھی جاتی ہیں جیسے کوئی سعادت مند اولاد اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے اثاثے کو آنکھوں سے لگا کر رکھتی ہے، اور وہ ہے مغربی بنگال۔

اِن سرزمینوں کی یہ گفتگو ہم نہیں کر رہے، بلکہ اُن ہی علاقوں کی معتبر شخصیتیں ہیں جن سے کہیں بسے بسائے گھر اجڑنے کی داستانیں سنیں گے اور کہیں وقت کے ہاتھوں مٹتے ہوئے نقوش کو بچانے کے جذبے اور احساس کی کہانیاں سنیں گے۔ بنگالی زبان کے سمندر میں اردو جزیروں کا احوال کلکتے کے جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ سنا رہے ہیں اور بہار کے مرحوم کتب خانوں کا ذکر برِصغیر کے نہایت معتبر اور محترم تاریخ داں پروفیسر سیّد حسن عسکری صاحب کر رہے ہیں۔

عسکری صاحب اس روز پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کے برآمدے میں ملے تو بیٹھے وہی کتابیں پڑھ رہے تھے جن کی رفاقت میں انہوں نے ایک عمر گزاری ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو بڑے بڑے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی ہوگی، ذرا اُن کا حال تو کہیئے۔ وہ دیر تک میرے چہرے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی طول کھینچنے لگی۔ یہ سکوت توڑنے کے لئے میں کچھ کہنے کو تھا کہ اتنی دیر میں کتنی ہی نئی پرانی یادیں ایک قطار سی باندھ کر ان کے ہونٹوں پر آگئیں اور وہ دیر تک اُن کتب خانوں کی باتیں کرتے رہے جو کبھی تھے۔

کہنے لگے کہ میرے گاؤں کا نام کھجوہ ہے۔ پرانے زمانے میں وہ کوس اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ سترھویں صدی میں اورنگ زیب نے وہ زمین ہماری ایک معظمہ بی بی بڑی کو بخش دی۔ ایک صدی بعد اسی ویرانے میں دیوان ناصر علی کا کتب خانہ قائم ہوا۔ جو بانی کھجوہ کے پوتے تھے۔ ان کی کتابوں پر ۱۲۱۳ھ یا ۱۷۹۹ء کی مہریں ہیں۔ دیوان ناصر علی کے ایک ملازم نے جو چریا کوٹ کے ایک بزرگ تھے ان کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔ اُس کو ہم نے دیکھا ہے۔ کچھ ورق پھٹے ہوئے تھے۔ اس کتب خانے میں ایک ہزار تیس کتابیں تھیں۔ سب کی سب قلمی۔ اور بہت سی تصویریں تھیں اور بہت سے خطاطی کے نمونے تھے۔ اور اس میں بعض بعض چیزیں نادرالوجود تھیں جیسے دیوان ہمایوں: کسی جگہ نہیں تھا۔ اور بہت سی کتابیں عصری تھیں، مثلاً عبدالرحمٰن چشتی کی کتاب مراۃ الاسرار اس پر حاشیہ خود مصنف کا تھا۔ اسی طرح سے بہت سی کتابیں تھیں ان کی لیکن ناقدروں نے اس کا خاتمہ کر ڈالا۔

خوش قسمتی سے دیوان ناصر علی کی کچھ کتابیں تباہ ہونے سے بچ گئیں اور وہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری نے دس ہزار روپے دے کر حاصل کریں۔

عسکری صاحب نے کہا کہ دیوان ناصر علی کے بڑے بیٹے کا کتابوں کا ایک ذاتی ذخیرہ تھا جس کو ہم نے دیکھا تھا۔ اُس میں خطِ کوفی میں قرآن مجید کے کئی نسخے تھے، اب نہیں رہے۔ ایک صاحب اور تھے جو داروغہ اکبر علی خان کہلاتے تھے۔ اُن کا ذاتی کتب خانہ الگ تھا ایک ذرا سے

کھجُوہ میں اتنا سب کچھ ہوسکتا ہے تو دوسرے علاقوں میں بھی کیا کیا نہ ہوگا۔

پٹنہ شہر کے بارے میں کہنے لگے "یہاں پر سلیمانیہ مدرسہ تھا۔ بہت بڑا ہال تھا۔ ہم نے خود دیکھا۔ بڑی بڑی الماریاں تھیں۔ ہر ایک الماری ایک خاص موضوع کے لیئے مخصوص تھی۔ کسی میں تاریخ، کسی میں تفسیر، کسی میں قرآن کے مُطلاّ و مُذہّب نسخے، کسی میں لُغات۔ مگر سب برباد ہوگیا۔ کچھ نہیں رہا۔"

میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں کیا ہماری کتابوں اور نوادر پر زوال آرہا ہے؟۔

کہنے لگے: "زوال کیا؟ ختم ہونے کے قریب ہیں۔ آپ سمجھئے کہ پٹنہ سٹی میں رائے سُلطان بہادر کا تستھ تھے۔ ان کے پاس مخطوطات، تصاویر اور آئیوری پینٹنگس کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہ تو مرگئے۔ وارث ان کا نابالغ تھا۔ لکھنؤ سے اُن کے ماما آئے جن کو کوئی خاص قسم کی ٹوپی پہننے کا شوق تھا۔ وہ دھوبی کو ایک ٹوپی دھلنے کو دیتے تھے تو اس کی دھلوائی میں ایک تصویر دے دیتے تھے۔ اس طریقے سے چیزیں برباد ہوئیں ان کے وکیل کی سفارش پر ہمیں ان کی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم گئے تو دیکھا کہ کتابوں کی الماری باورچی خانے کے نزدیک رکھی ہے۔ اس میں سے کچھ چیزیں بچا کر لائے

ایک ماتھر خاندان کا سنئے۔ راجا پیارے لال، شاہ عالم کے بیٹے اکبر ثانی کے مشیر تھے۔ بڑے قابل تھے۔ عربی فارسی کے عالم تھے۔ شاہ عالم سے انگریزوں نے جو دیوانی کی سند لی تھی اور جو وعدے وعید کئے تھے، بعد میں انگریزوں نے وہ وعدے پورے نہیں کئے۔ اس پر راجا پیارے لال نے بادشاہ کے سارے کاغذات درست کئے اور اتنا کام کیا کہ آنکھ خراب ہوگئی۔ انگریزوں نے دیکھا کہ یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ چنانچہ ریذیڈنٹ نے دباؤ ڈال کر انہیں پٹنہ بھجوادیا اور ایک بڑی جائداد ان کو دی گئی۔ راجا پیارے لال نے یہاں آکر دبستان شاعری قائم کیا۔ ان کا کتب خانہ بڑا عظیم الشان

تھا۔ ہم نے دیکھا۔ اس خاندان والوں نے ہمیں بلایا تھا کہ جو کچھ بچی کھچی کتابیں ہیں انہیں ذرا سا ٹھیک کر دو۔ فہرست میں چھ ہزار کتابوں کا اندراج تھا۔ مگر وہاں کچھ باقیات و صالحات تھیں۔ اب وہ ناپید ہیں، ختم ہو گئیں۔

ایک دوسرا منتقر خاندان تھا۔ ہم وہاں گئے۔ ان کو تردّد تھا دکھانے میں، خیر، بصد دقت دکھایا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ ایک اور صاحب کا تُستھ تھے۔ ہم ان کے ہاں گئے تو دیکھا کہ ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہفت اقلیم وغیرہ بہت سی کتابیں تھیں۔ ہم نے کہا کہ آپ رکھ کر کیا کیجئے گا۔ ہم کو دے دیجئے۔ چاہیں تو قیمت لے لیجئے۔ بگڑ گئے کہ آپ ہم کو کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کو دکھلا دیا تو آپ سمجھتے ہیں کہ ہم غریب ہو گئے ہیں؟

یہ کیفیت ہے۔ کتابیں برباد ہو جائیں لیکن دیں گے نہیں۔"

یہ تو ہوئی پروفیسر حسن عسکری صاحب کی بات چیت جس کی خاطر میں پٹنہ تک پہنچا۔ بد قسمتی سے مغربی بنگال میرے سفر میں شامل نہ تھا۔ سوچا تھا کہ بنگال میں فی زمانہ عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا کیا کام؟ لیکن شاید میری چھٹی حس مجھے ستائے جا رہی تھی اور میری قسمت میرا ہاتھ تھامنے کی ٹھانے ہوئی تھی کہ دورانِ سفر شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ بنگالی ہیں لیکن اُردو کی دھن میں مگن ہیں۔ میں نے درخواست کی کہ کچھ بتا دیجئے کیونکہ بنگال کے بغیر کتابوں اور کتب خانوں کی گفتگو ادھوری رہی جاتی ہے۔

فوراً میری گفتگو پوری کرنے پر کمر بستہ ہو گئے اور بتانے لگے کہ کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ کلکتے میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں ہے۔ وہاں عربی، فارسی اور اُردو کے سینکڑوں قلمی نسخے ہیں اور یہی حال دوسری مشرقی زبانوں کا ہے مثلاً پشتو میں خوشحال خاں خٹک کی تصانیف وہاں موجود ہیں۔

ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری جو پہلے امپریل لائبریری تھی اور آزادی کے بعد

نیشنل لائبریری ہوگئی وہیں کلکتے میں ہے۔ میں نے شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب سے پوچھا کہ وہاں بھی مشرقی علوم کی کتابیں ہیں یا نہیں؟

انہوں نے کہا "وہاں بہت سے سیکشن ہیں جن میں خاص کر بوہار سیکشن قابلِ ذکر ہے یہاں وہ کتابیں جو نواب بوہار نے بطور عطیہ دی تھیں۔ اِن میں عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے مخطوطے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قابلِ ذکر سیکشن امام باڑہ ہُگلی سیکشن کہلاتا ہے۔ یہ کتابیں پہلے امام باڑہ ہُگلی میں تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے زمانے میں یہ کتابیں نیشنل لائبریری میں منتقل کر کے محفوظ کی گئیں۔ اب یہ کتابیں امام باڑے کے بانی حاجی محمد محسن مرحوم کی یادگار ہیں۔"

بنگال کا ذکر مرشد آباد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ وہاں کے نوابوں کا کتب خانہ علم کی دولت کا شاندار نمونہ ہے۔

بھٹاچاریہ صاحب نے بتایا "مرشد آباد کے ہزار دواری محل میں یہ کتب خانہ قائم ہے۔ لیکن اب چند برسوں سے ٹرسٹ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں چنانچہ یہ کتب خانہ فی الحال بند ہے۔ بہت جلد کچھ انتظامات ہو جائیں گے کیونکہ حکومت اس سے کافی دلچسپی رکھتی ہے، اور کچھ ایسے انتظامات کئے جا رہے ہیں تاکہ یہ لائبریری حکومت کے تحت لے لی جائے کیونکہ اس میں ہزاروں کی تعداد میں عربی، فارسی اور اُردو کے مخطوطات بھی ہیں۔ آرٹ کے بے شمار نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم انگریزی ادب بھی ہے۔ تو یہ بیش بہا خزانہ مرشد آباد میں عرصے سے جمع ہے۔ قدیم دور میں مرشدآباد بھی ایک علمی مرکز رہا ہے اور وہاں فارسی اور اردو کے بہت سے شعراء رہے ہیں ان کے بھی بیشتر مخطوطے وہیں موجود ہیں۔"

اس کے علاوہ کلکتے کے باہر اتر پاڑا پبلک لائبریری ہے جو پہلے وہاں کے جاگیردار راج کشن راؤ کی اپنی لائبریری تھی۔ کسی زمانے میں وہاں اسکالروں کے قیام کا

انتظام بھی تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ بَرِصغیر کی سب سے قدیم رہائشی لائبریری ہے۔ اب اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں بھی عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا بڑا ذخیرہ ہے۔ گو اُس علاقے میں اب اِن زبانوں کے پڑھنے والے نہیں رہے لہٰذا وہاں کوئی فہرستِ کتب بھی نہیں ہے۔ جو لوگ جاتے ہیں انہیں وہ کتابیں خود ہی نکال کر دیکھنی ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ غنیمت ہے کہ کچھ قدیم تصانیف وہاں محفوظ رہ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اُور کتب خانے قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً بہار گھرانے کا کتب خانہ یہ خاندان پہلے مرشد آباد میں تھا لیکن بعد میں کلکتے میں بس گیا۔ یہ بہت بڑا کتب خانہ ہے اور اس میں بھی چند قدیم فارسی اور اردو مخطوطے موجود ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی کی لائبریری بھی بہت بڑی ہے اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کا کتب خانہ بھی قابلِ ذکر ہے۔"

تو یہ ہے کلکتے کا وہ ذکر جو ایک تیر مرے سینے پر مارتا ہے۔ اب آپ اپنے سینے کی کہیئے!

وہ جو راہ میں رہ گئے

کتابوں کی دنیا کے سفر میں اگر آپ یہاں تک آگئے ہیں تو سمجھئے کہ میری طرح آپ کو بھی نہایت محترم کتب خانوں کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ہم نے ہمالیہ سے لے کر بحر ہند کے ساحلوں تک شہروں، قصبوں اور بستیوں میں قرینے سے آراستہ کتابیں بھی دیکھ لی ہیں اور تاریک کوٹھڑیوں میں سسکتے وہ پریشان ورق بھی دیکھے ہیں جنہیں اب شاید دن کا اُجالا دیکھنا نصیب نہ ہو۔

مگر ہمیں اعتراف ہے کہ کتب خانوں کا یہ جائزہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تحقیق کریں اور کتنی ہی جستجو، نگاہ ہر جگہ نہیں پہنچ سکے گی۔ بھول چوک ہو گی ضرور اور کچھ محترم نام اور مقام یقیناً چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ ہم ہر اُس فرد اور ہر اُس کتاب سے معافی کے خواست گار ہیں کہ جس کا ذکر آنا چاہیے تھا مگر نہ آسکا۔

ہوا یہ کہ وارفتگی کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہم آگے نکل گئے تو بہت سی آوازوں نے ہمیں للکارا۔ فلاں کتب خانہ رہا جاتا ہے، فلاں ذخیرہ کو بھولے جاتے ہو، فلاں

مشفق خواجہ نے کہا" بنارس یونیورسٹی کو نہ بھول جائیے گا۔ وہاں کا اردو فارسی کا ذخیرہ بھی خاصا اہم ہے۔ خمخانۂ جاوید کے مصنف لالہ سری رام کی وصیت کیمطابق ان کا کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا جس سے اس کی اہمیت بڑھ گئی"

بہاولپور یونیورسٹی کے اسلم ادیب نے ایک اور ذخیرے کی طرف توجہ دلائی۔ "نواب صاحب بہاولپور کے ذاتی کتب خانے کے بارے میں صحیح طور پر بتانا مشکل ہے کیونکہ ہر ممکن کوشش کے باوجود میں اُسے دیکھ نہ سکا لیکن اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم ہے کہ اُردو کی ہر کتاب کا ایک نسخہ وہاں ضرور محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا کہ وہاں خطوط کا ایک بڑا مجموعہ ہے جن میں علامہ اقبال اور قائد اعظم کے وہ خط بھی شامل ہیں جو انہوں نے نواب صاحب کو لکھے تھے"

سکندر علی وجد نے بھی ایک داستان الم کہہ سنائی، نظام دکن کے ذخیرۂ کتب کی بات کر رہے تھے۔" پولیس ایکشن کے بعد میں بڑے شوق سے کنگ کوٹھی گیا۔ وہاں میرے ایک دوست تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو کتابوں کا شوق ہے تو کنگ کوٹھی میں کتابیں بھی ہیں دیکھ لیجئے۔ میں دیکھنے گیا تو حیران رہ گیا کہ ایسی بے مثال کتابیں، کھلے برآمدوں میں الماریوں میں رکھی ہیں۔ قریب سے دیکھا تو ہر کتاب مٹی کا تودہ بن چکی تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لیکن اگر انگلی لگائیے تو انگلی اندر دھنس جاتی ہے۔ تو میں نے تمام کتابوں کا یہ حشر دیکھا وہاں ایک کتاب سلامت نہیں تھی"

گوپی چند نارنگ نے یاد دلایا" ایک ذخیرہ اور ہے اور بڑا ہی دلچسپ ہے، وہ ہے مہاراجہ پٹیالہ کا کتب خانہ جو آج بھی پٹیالہ میں موجود ہے البتہ اس کی کچھ کتابیں پنجاب یونیورسٹی میں چلی گئی ہیں۔ علوم شرقیہ کے محقق وہاں اکثر جاتے رہتے ہیں بلکہ آبرو کا نسخہ اور ناجی کا نسخہ اُسی ذخیرے سے ملا ہے جسے بعض لوگوں نے شائع کیا ہے"

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے بتایا" مدراس میں کتب خانۂ محمدیہ بڑا قدیم کتب خانہ

ہے۔ یہ عادل شاہوں کے دور کا ہے۔ اس کتب خانے میں اسلامیات اور تاریخ پر عربی اور فارسی کا نہایت نادر ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی خطوط ٹیپو کے اور اس سے پہلے عادل شاہوں کے اور احمد نگر کے نظام شاہوں کے اتنے زیادہ ہیں کہ اُن جیسا ذخیرہ کہیں اَور نہیں مِلتا۔"

اعظم گڑھ تحقیق اور تدریس کا مرکز ہے۔ وہاں دارالمصنّفین جیسا ادارہ ہے اور معارف جیسا جریدہ شائع ہوتا ہے۔ علوم اسلامیہ کے جیّد عالم اعظم گڑھ سے وابستہ رہے ہیں اور اسی مناسبت سے وہاں نہایت عظیم الشان کتب خانے قائم ہیں جن میں تفسیر، حدیث، سیرت، مغازی، تاریخ اور فقہ جیسے علوم پر دنیا بھر کی مطبوعات جمع ہیں اور ہر روز ان میں اضافہ ہو رہا ہے! ادبیات کا بھی وہاں نادر ذخیرہ ہے اور مختلف علوم کے نایاب مخطوطے جمع ہیں۔

مبارک پور۔ اعظم گڑھ سے قاضی حسان احمد صاحب نے لکھا: "اس دور افتادہ علاقے میں بھی ایک حیرت انگیز کتب خانہ موجود ہے جس کے مالک مورّخِ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔ چونکہ مولانا کا خاص موضوعِ تحقیق عرب و ہند کے تعلقات اور اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ہے، اس لئے ان کے ذاتی کتب خانہ میں اس موضوع پر نادر اور بنیادی ماخذ کا درجہ رکھنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کتب خانہ قاضی میں تاریخ، رجال، حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت، سوانح، ملفوظات، ذکر و دعا، فلسفہ، منطق اور علم کلام پر تین ہزار عربی، فارسی اور اردو کتابیں جمع ہیں۔"

رائچور، کرناٹک سے اردو کے استاد سید امین الدین صاحب نے بھی ایسے ہی ایک کتب خانے کا احوال لکھ بھیجا: "حیدر آباد دکن کے جنوب میں شہر رائچور ہے۔ اس شہر میں حضرت علامہ مولانا سید جنید الحسینی علیہ الرحمتہ کی شخصیت علم و فضل میں آفتاب کی طرح روشن ہے۔ آپ کو علم دینی اور کتب کی فراہمی سے بڑی نسبت تھی۔ آپ نے عمر کے اٹھارہویں سال ہی سے کتابیں جمع کر کے اپنی آخری عمر تک ایک عظیم کتب خانہ قائم کر دیا۔ جس میں استنبول، قاہرہ اور ہند و پاک

کی مطبوعہ عربی اور فارسی کتابوں کے علاوہ مخطوطات کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔"

گوپی چند نارنگ نے بتایا۔" کچھ نجی کتب خانوں پر بڑی افتاد پڑی ہے، مثلاً دلّی کی نذیریہ لائبریری جسے، آپ کو معلوم ہے، دِلّی کے تاریخی خاندانوں نے قائم کیا تھا۔ اس کی دو تین جگہیں بدلی گئیں، آخر وہ پُرانی گلیوں میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد جن ورثا کے ہاتھ میں وہ لائبریری آئی وہ ان نوادر کی اہمیّت نہیں جانتے تھے، مخطوطات کی قدر و قیمت کا انکو پتہ نہیں تھا چنانچہ ایک ایک کر کے وہاں سے مخطوطات غائب ہونے شروع ہوتے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ ذخیرہ کہاں گیا۔ اردو معاشرے کا اتنا بڑا قومی سرمایہ یوں برباد ہوا۔ اب حال میں سنا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کی کوششوں سے اُس کا کچھ حصّہ اسلامک انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد میں چلا گیا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ خود حکیم صاحب نے قائم کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کے ذہن و تخیل کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تحقیقات کے لئے ایک ادارہ وہاں قائم کیا ہے جو بڑا ہی زبردست کتب خانہ ہے۔ اس کے ڈائریکٹر سیّد اوصاف علی کی کوششوں سے نجی کتب خانوں کی بہت سی کتابیں اب تغلق آباد میں محفوظ ہو رہی ہیں۔"

ظہران، سعودی عرب سے ایک بزرگ محمد حامد اللہ صاحب نے تحریر فرمایا۔" ہندوستان میں ہمارے بزرگوں کا بھی ایک مشترکہ کتب خانہ تھا۔ الحمدللہ کہ ہمارے اعزّا نے یہ کتب خانہ ہمدرد ٹرسٹ کے حکیم عبدالحمید صاحب کو دے کر محفوظ کرادیا۔ اس کے صرف ایک عربی مخطوطے کا حال والد مرحوم سے سنا تھا کہ جب دادا مرحوم حج پر گئے تھے تو کتاب کو تول کر اور ہم وزن سونا دے کر اسے لائے تھے۔ اس کا نام شذور الذہب ہے۔ یہ صرف ایک کتاب کا حال تھا۔"

مشفق خواجہ نے ایک اور شاندار ذخیرے کے بارے میں بتایا۔" پاکستان

ہیں ایک ذخیرہ اور بھی ہے جو حالیہ زمانے میں وجود میں آیا ہے۔ وہ ہے ادارۂ تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان۔ یہ حکومتِ ایران کا ادارہ ہے جس کا صدر دفتر اور لائبریری راولپنڈی میں ہے۔ انہوں نے مخطوطات کی خاصی بڑی تعداد جمع کی ہے اور ان کی فہرستیں بھی چھاپی ہیں۔ مخطوطے خریدنے پر انہوں نے خاصی رقم صرف کی۔ مثلاً بہت سے مخطوطات مسجدوں میں پڑے رہتے ہیں۔ یا بعض گھرانوں میں عربی مخطوطے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ لازماً کوئی کوئی مقدس کتاب ہوگی خواہ وہ تاریخ ہو یا کوئی دوسرا موضوع، وہ مسجدوں میں ڈال جاتے ہیں۔ تو اس ادارے کے وجود میں آنے کے بعد بعض لوگوں نے ایسی ہی کتابیں جمع کر کے ان کے ہاتھ بیچنی شروع کیں۔ ادھر یہ ہوا کہ افغانستان کی طرف سے بھی بعض لوگ کتابیں لے کر آتے تھے۔ وہ کتابیں بھی ادارے والوں نے خریدیں، اِس طرح وہاں بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔"

احمد آباد، گجرات سے ریٹائرڈ چیف جج عابد علی واقف صاحب نے لکھا۔" آپ نے بہت سے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے لیکن شائد آپ کو علم نہ ہوگا سورت کے جامعہ سیفیہ میں جو ڈاکٹر سیّدنا محمد برہان الدین صاحب کے زیرِاہتمام ہے، ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے جس میں خاص طور سے عربی کے بہت سے پرانے نسخے ہیں۔ وہاں خلافت بنو فاطمہ کے زمانے کی کتابیں بھی ہیں جن کا تعلق گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے مصر اور شمالی افریقہ سے ہے۔ ان نایاب نسخوں میں خصوصاً سیّد قاضی النعمان اور ویسے ہی دیگر علماء کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں ہیں۔ سورت کی اس لائبریری کا کچھ حصّہ ممبئی میں ہے۔"

گوپی چند نارنگ نے کہا "ممبئی آج بھی اور پچھلی صدی سے علومِ شرقیہ کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ وہاں انجمنِ حمایتِ اسلام کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا

کتب خانہ ہے۔ اسے میرے کرم فرما اور بزرگ نجیب اشرف ندوی صاحب نے قائم کیا تھا جو بڑے معرکے کے آدمی تھے اور انہوں اردو کی بڑی بے لوث خدمت کی۔ اسی کتب خانے میں عبدالرزاق قریشی صاحب نے نوائے آزادی جیسی کتاب ایڈٹ کی اور اسی کتب خانے کی مدد سے گجری کی لغت ایڈٹ کی۔"

بمبئی کی جامع مسجد عربی فارسی اور اردو کی آٹھ ہزار کتابوں کا ایک شاندار ذخیرہ احتیاط سے لئے بیٹھی ہے، مگر بہت کم محقق اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جامع مسجد بمبئی کے اس کتب خانے میں عربی کے سوا چھ سو، فارسی کے پونے پانچ سو اور اردو کے ڈیڑھ سو مخطوطے محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ چھپی ہوئی کتابوں، اخباروں اور رسالوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں تفسیر حدیث، سیرت، تصوّف اور تاریخ کے علاوہ ادبیات پر بہت نایاب کتابیں مل جاتی ہیں۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اس قدیم کتب خانے کے ریکارڈ کے مطابق اب تک وہاں سے صرف اکیس ۲۱ کتابیں گم ہوئی ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ بہت کم لوگ ان کتابوں سے استفادہ کرنے وہاں جاتے ہوں۔ میں نے مہمانوں کی جس کتاب پر دستخط کئے اس پر مجھ سے پہلے والے مہمان نے پانچ سال قبل دستخط کئے تھے۔

بمبئی کی ایک دلچسپ شخصیت کے بارے میں مشفق خواجہ نے یاد دلایا" وہاں سب سے اہم آدمی جو ہے وہ کالی داس گپتا رضا صاحب ہیں۔ وہ شاعر، ادیب اور محقق ہیں۔ متعدد کتابیں ان کی چھپ چکی ہیں۔ وہ صاحب نظر ہیں۔ انکی لائبریری بہت شاندار ہے۔ پیشے کے اعتبار سے تو ساہوکار ہیں لیکن ذوق وشوق کے اعتبار سے قابلِ قدر شخصیت ہیں۔ ان کے پاس آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ خاص طور پر شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کا ایک بڑا نادر مخطوطہ ان کے پاس ہے۔"

اس پر گورنمنٹ کالج، ملتان کے استاد لطیف الزمان خاں صاحب نے لکھا" مجھے آپ سے ایک شکایت ہے کہ کالی داس گپتا رضا صاحب کا تعارف آپ نے

اس طرح نہیں کرایا جیسا اسے ہونا چاہیئے۔ دنیا میں سب سے بڑا غالبیات کا کلکشن انہی کے پاس ہے۔ ہر موضوع پر نادر و نایاب کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شخصی لائبریری ہند و پاک میں شاید ہی ایسی کوئی اور ہو۔"

خود لطیف الزماں صاحب کے بارے میں اسلم ادیب نے بتایا:" وہ انگریزی کے اُستاد ہیں لیکن اردو ادب سے ان کی جو محبت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہر اچھی کتاب کو لینے کے لئے وہ خوراک یا لباس کی خریداری ٹال جاتے ہیں۔ آپ اگر ان کے گھر میں جائیں تو ان کے کمروں کی دیواریں نظر نہیں آئیں گی بلکہ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔ خصوصاً غالبیات کا حصہ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کسی شاعر سے محبت کرنے کا ہنر شاید لطیف الزماں صاحب ہی کو آتا ہے۔"

اور آخر میں وہ کتب خانہ جو اوّلیت میں کسی سے کم نہیں اور وہ ہے پاکستان کے صوبہ سندھ میں شکارپور کے قریب گڑھی یاسین کا کتب خانہ جو آغا بدرالدین درّانی مرحوم کی یادگار ہے۔ اس میں سارے ہی مشرقی علوم پر ہزاروں کتابیں جمع ہیں جن کے مطالعے کے بغیر تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی چونکہ دور دراز علاقہ ہے اس لئے اس کی عمارت میں علماء اور محققوں کے قیام اور کھانے پینے کا بندوبست بھی ہے اور کتابیں جدید طریقے پر ترتیب دے کر جمائی گئی ہیں۔

باقیات و صالحات کی یہ بات شاید کبھی اور کہیں ختم نہ ہو۔ دور دراز علاقوں میں موجود کتابوں کا حال کون تکمیل کو پہنچا سکتا ہے؟ دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ اس بیابان میں کوئی آبلہ پا آئے جو خار کو موتی کی لڑی کر دکھلائے۔

باپ دادا کی ہڈیاں

وقت گزرتا ہے تو قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

کتابیں بھی گزرے وقتوں کی نشانیاں ہیں۔ لیکن کہیں تو یہ نقشِ پا چراغ بن کر جگمگا رہے ہیں اور کہیں مِٹ گئے ہیں، بجھ گئے ہیں اور اب وہاں اندھیروں کا بسیرا ہے۔

کتابوں کے اس سفر میں اب ہم جن راستوں پر چلیں گے وہ ہمیں خلیج بنگال کے کناروں سے کیرالہ کے ساحلوں تک اور مہاراشٹر کے میدانوں سے راجستھان کے ریگستانوں تک لے جائیں گے۔ راہ میں ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں کی بستیاں بھی پڑیں گی۔

اور آج ہم دیکھیں گے کہ کہاں کہاں کیسی کیسی کتابیں، دستاویزیں، ریکارڈ اور فرمان دیکھے گئے اور جن میں سے زیادہ تر کے بارے میں اب شاید خدا ہی جانتا ہو گا کہ وہ رہے یا خاک میں مِلے۔

میں حیدر آباد دکن میں تھا، اردو ریسرچ سنٹر کے محمد عبدالصمد خاں نے مجھے ایک صاحب کے بارے میں بتایا۔ کہنے لگے،

"وہ قاضی صاحب کہلاتے ہیں اور خاندانی قاضی ہیں۔ اورنگ آباد سے تقریباً دو ڈھائی سو میل دور ایک گاؤں ہے جہاں ان کے باپ دادا وغیرہ قاضی تھے۔ خود بہت معمولی مدرس ہیں۔ شاید ڈیڑھ دو سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی۔ بیچارے بہت ہی بُرے حالوں میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے پاس ایک خاندانی کتب خانہ ہے، اس کو آپ لے جائیے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ آپ کا اندازہ کیا ہے، اُس میں کتنی کتابیں ہوں گی۔ تو ان کا اندازہ تھا کہ سولہ سو کے قریب کتابیں ہیں جن میں تین چار سو کے درمیان ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بھی مخطوطہ چار سو برس سے کم کا نہیں ہے اور اسی طرح چھپی ہوئی کتابیں بھی بہت اہم ہیں۔ میں نے ان سے قیمت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ یہ میں آپ کو تحفتاً دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں ان کو سنبھال نہیں سکتا۔ میں نے ان سے کہا میں آپ کو ساڑھے تین ہزار روپے نذرانہ پیش کرنا چاہوں گا۔ بہت خوش ہوئے کیونکہ ساڑھے تین ہزار ان کے لئے بہت بڑی رقم تھی۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ مجھے اورنگ آباد سے ایک بس کے ذریعہ تقریباً ڈیڑھ سو میل جانا ہے۔ وہاں سے کشتی میں گوداوری پار کرنا ہے، پھر بس پکڑ کر ساٹھ میل جانا ہے، پھر تقریباً تیس پینتیس میل پیدل چلنا ہے۔ تو اب اندازہ لگائیے کہ اس کتب خانے کو وہاں سے منتقل کرنا کتنا مشکل تھا، لہٰذا میں نے اُسے چھوڑ دیا۔"

پاکستان کے ممتاز دانشور اور افسانہ نگار جناب قدرت اللہ شہاب کو ایک مرتبہ خلیج بنگال کے ساحل پر اڑیسہ کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ قدیم کتابیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شہاب صاحب نے بتایا:

"میں ایک بہت ہی دور دراز علاقے میں گیا جہاں ایک گاؤں تھا اور اس گاؤں میں قدیم کتابیں تھیں۔ میں سن چوالیس میں گیا تھا اور مجھ سے پہلے علاقے کا سرکاری

افسر ۱۹۰۱ء میں وہاں گیا تھا۔ وہاں پر عجیب و غریب پرانی کتابیں اور مخطوطات نظر آئے۔ کچھ ہندی میں تھے۔ چونکہ مجھے ہندی بھی آتی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ بہت نایاب کتابیں ہیں۔ کچھ اُردو کی اور کچھ عربی کی کتابیں بھی تھیں۔ وہ گاؤں سمندر کے کنارے تھا اور پُرانے زمانے میں عرب ملاّح اور تاجر وہاں آتے جاتے رہتے تھے، عین ممکن ہے کہ یہ کتابیں وہی چھوڑ گئے ہوں۔"

حیدر آباد دکن کے کتابوں کے ایک تاجر علیم الدین صاحب اب ضعیف ہو گئے ہیں اور بہت زمانے دیکھ چکے ہیں۔ جان جوکھوں میں ڈال کر کتابوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے بتا رہے تھے کہ شہنشاہ اکبر کے فرامین کی خبر پاکر وہ راجستھان کے ریگستانوں میں جا پہنچے۔ کہنے لگے:

"میں جے پور گیا ہوا تھا۔ جب کبھی جے پور جاتا ہوں، عموماً یادگار سرائے میں ٹھہرتا ہوں۔ ایک روز میں قلعہ دیکھنے کے لئے نکلا جو شہر سے دور ہے۔ قلعے کی سیر کے بعد میں پہاڑی سے نیچے اترا۔ وہیں قریب ہی ایک مسجد ہے۔ اس مسجد میں اکبر کے زمانے کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ میں اس کی عبارت کی نقل کر رہا تھا کہ مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک شخص مجھے دیکھ کر رُکا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں تو میں نے کہا کہ بھائی میں یہ پُرانی عبارت نقل کر رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ کیوں نقل کر رہے ہیں۔ تو میں بولا کہ میں ایسی ہی چیزوں کا بیوپاری ہوں۔ شہر شہر گھوم کر پرانی چیزیں خریدتا ہوں۔ کتابیں خریدتا ہوں۔ فرامین خریدتا ہوں۔ یہ سب اسے بتایا تو اُس نے کہا کہ یہاں سے پچیس تیس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے وہاں شہنشاہ اکبر کے زمانے کے کاغذات ہیں۔ اکبر نے مان سنگھ کو جو اسناد دیئے تھے وہ بھی ہیں۔ اگر آپ چلیں تو مِل سکتے ہیں۔ میں تیار ہو گیا اور پوچھا کہ کس طرح چلیں گے۔ وہ بولا کہ اگر اونٹ پر چلیں تو آسانی سے اور جلد پہنچ جائیں گے۔ ویسے

بھی اس علاقے میں کوئی گاڑی نہیں جا سکتی۔ میں نے وہ بھی منظور کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک اونٹ کرائے پر لے آیا جس پر کجاوا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے اونٹ کی خالی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ اب وہ اونٹ ریت میں چلا تو آپ جانتے ہیں کہ اونٹ کا کوہان اونچا ہوتا ہے۔ میں جونہی سنبھل کر بیٹھا نیچے سرک جاتا۔ جونہی بیٹھتا، سرک جاتا۔ اوپر سے غضب یہ کہ اونٹ کے بال بڑے سخت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری رانوں کی کھال اڑ گئی اور بری حالت ہوگئی۔

خیر جوں توں کر کے گاؤں میں پہنچے۔ پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے صحیح نشاندہی کی تھی۔ وہاں اکبر کے فرامین ملے۔ وہ تو خیر ملے لیکن اب اسی اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر واپس جے پور آیا۔ حالت بہت خراب ہوگئی۔ دو روز تک تو بیمار رہا۔ خیر، وہ اسناد لاکر حیدر آباد کے باغ عام کے میوزیم میں محفوظ کرا دی ہیں۔ وہ یہاں موجود ہیں۔"

قدرت اللہ شہاب صاحب نے ایک اور واقعہ سنایا اور یہ صرف واقعہ نہیں بلکہ نشاندہی ہے تاریخ کے ایسے ریکارڈ کی جو برصغیر کے ہر ضلع میں آج بھی موجود ہوگا اور جسے اگر محفوظ نہ کیا گیا تو ہمارے تاریخ کی کتنی ہی گواہیاں مٹ جائیں گی۔ شہاب صاحب نے کہا:

"جو ریکارڈ ڈپٹی کمشنروں کے دفتروں میں ریکارڈ آفس میں محفوظ ہے وہ بڑا بیش قیمت ہے اور تاریخ کا بہت ہی بڑا خزانہ ہے۔ ایک زمانے میں جب میں ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا تو مجھے شوق ہوا کہ ہیر رانجھا کی تحقیق کروں۔ تو میں نے ریکارڈ آفس کھلوایا جو سالہا سال سے بند پڑا تھا۔ اس میں رجسٹروں کے علاوہ سانپ ہی سانپ تھے۔ کسی طرح سے میں نے رجسٹر نکلوائے تو ۲۵ سال کے رجسٹر ایک ہی شخص کے خوشخط ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کے ساٹھ سال کے رجسٹر بھی ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اتنے خوش خط کہ دیکھ کر انسان پرنٹنگ پریس کو

بھول جاتا تھا۔ لیکن ہیر رانجھا کی تحقیق مجھ سے نہ ہو سکی البتہ مرزا صاحباں کا نشان ملا۔ وہ قصبہ جھنگ کے علاقے کا تھا، وہاں پر مرزا صاحباں کی قبر بھی تھی۔ تو میں نے اس کی تحقیق کی۔ ان تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن ان کے خاندان کی تین پیڑھیوں تک اس ریکارڈ سے میں نے پوری تحقیق کر لی۔ تو اسی طرح ہر دفتر میں، ہر ڈپٹی کمشنر کے ہر ضلع میں جو ریکارڈ خانہ ہے اس کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جانا چاہیئے جیسے بہت ہی بڑے بیش بہا خزانوں کو محفوظ کیا جاتا ہے۔"

اور اب آخر میں کچھ ایسی پرانی عربی کتابوں کا ذکر جو کیرالہ کے ساحل پر مچھیروں کی ایک بستی میں چھینکے میں رکھی ہوئی پائی گئیں۔ ان کا واقعہ عبدالصمد خاں صاحب کو ان کے ایک دوست اے جی فاروقی صاحب نے سنایا جو اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں کیرالہ گئے تھے۔ صمد صاحب نے بتایا۔

"فاروقی صاحب کا بیان ہے کہ وہ دیہاتی علاقے سے گزر رہے تھے تو راستے میں ایک پرانا قبرستان ملا جو بہت ہی خوبصورت تھا۔ قبریں اور ان کے کتبے اتنے عمدہ تھے کہ دیکھ کر ان سے رہا نہیں گیا اور اتر کر انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو دس بجے صبح سے شام پانچ بجے تک اس کے مختلف کتبوں کو نقل کرتے رہے۔ پانچ بجے کے قریب کچھ گاؤں والے وہاں سے گزرے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ قبرستان کس کا ہے؟ کوئی اس کے وارث ہیں یا نہیں؟ تو گاؤں والوں نے کہا کہ وہ جو جھونپڑیاں نظر آ رہی ہیں، وہ لوگ آکر کبھی چراغ جلا دیتے ہیں۔ وہ مچھیروں کی بستی تھی۔ تو جب فاروقی صاحب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہاں تقریباً سبھی مسلمان تھے۔ تو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ہاں صاحب ہمارے باپ دادا کی قبریں ہیں۔ اچانک ان کو چھینکے پر کچھ کتابیں ٹنگی ہوئی نظر آئیں۔ فاروقی صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو گاؤں والوں نے کہا کہ صاحب، خدا کی کتابیں ہیں۔ انہوں نے





کہا کہ میں دیکھوں؟۔ تو ان کا بیان ہے کہ وہ فلسفہ، منطق، طب اور ریاضی پر عربی کی بہت قدیم کتابیں تھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تم ان کو قرآن سمجھ رہے ہو۔ یہ قرآن شریف نہیں ہے بلکہ حکمت کی اور حساب وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ان کو بیچ دو۔ تم کیوں رکھے ہوئے ہو؟۔ اس پر گاؤں والوں نے کہا کہ واہ صاحب واہ۔ ہم باپ دادا کی ہڈیاں بیچ دیں؟ تو آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہمارے ہاں کتابوں کا ذخیرہ کس طرح منتشر ہے اور کیا کیا نایاب چیزیں دفن ہیں۔"

کل کا حال نہیں معلوم

لکھنؤ کے ٹوریا گنج سے چل کر، اونچی نیچی، تنگ اور پُرپیچ گلیوں سے گزر کر، کشمیری محلے سے ہوتے ہوئے ہم ایک پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی گلی میں کھلنے والی بڑی سی کھڑکی کی روشنی میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ بڑھاپے نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ گردن اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ بس یہ وہ عمر تھی جب انسان کو زندگی کے بکھیڑے چھوڑ کر، عمر بھر کی تھکن کے بعد خوب بہت سا آرام کرنا چاہیے۔ مگر وہ بزرگ اپنی عمر سے بھی چار پانچ گنی عمر کی ایک کتاب پر جُھکے، اس کی پُرانی اور بوسیدہ جلد کو درست کر رہے تھے۔

یہ لکھنؤ کے نادر آغا تھے۔ جن لوگوں کو پرانی اور کمیاب کتابوں کی خرید و فروخت سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے وہ نادر آغا صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔

تقریباً اسّی برس پہلے ان کے والد نے اس وقت کے رنگوں میں نہائے اور خوشبوؤں میں رچے بسے لکھنؤ میں پُرانی کتابوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ نادر آغا کو اُن ہی سے یہ کاروبار اور پُرانی کتابوں کو سنوارنے کا فن ورثے میں ملا۔ مگر یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے کی بس وہ آخری

کڑی ہیں۔ اس کے بعد ان کے گھرانے میں اس کاروبار کو ختم ہی سمجھئے۔

پہلی بات جو ہم نے نادر آغا صاحب سے پوچھی وہ یہ تھی کہ پرانی کتابوں کی قدر کس زمانے میں زیادہ رہی۔ آج کے دور میں یا اگلے وقتوں میں؟ نادر آغا نے ایک چھوٹے سے واقعے میں سب کچھ کہہ سنایا۔ مخصوص لکھنوی لب و لہجے میں کہنے لگے۔

"مرزا رُسوا کے یہاں ایک شام دوستوں کی نشست تھی۔ سب بیٹھے تھے کہ پُرانی کتابوں کا تاجر ایک کتاب لے کر آیا۔ مرزا صاحب نے دام جو پوچھے تو ایسے دام تھے جو مرزا صاحب کی سمجھ میں نہیں آئے۔ کتاب واپس کر دی۔ لیکن کتب فروش کو جانتے تھے۔ تو گھر آئے، بیوی سے کہا اپنے سونے کے کڑے دے دو۔ اور ان کو جدا کیا۔ جدا کر کے وہ کتاب تاجر سے جا کر لی۔ دوسرے دن مرزا صاحب کے یہاں پھر نشست ہوئی تو دوستوں سے کہنے لگے کہ میں نے وہ کتاب لے لی۔ دوستوں نے کہا کیسے؟ دام تو اس کے اتنے زیادہ تھے! مرزا صاحب کہنے لگے" ہاں۔ کڑے کی جوڑی بیچ کے خریدی ہے۔ جوڑی تو دستیاب ہو جائے گی مگر کتاب نہیں ملے گی" تو یہ قدر کا عالم تھا۔ لوگ اِس اِس صورت سے حصولِ کتب کے لئے یہ جد و جہد کرتے تھے۔"

یہ واقعہ سنا کر انہوں نے حقّے کا ایک کش لیا اور ہم نے بڑے ادب سے پوچھا کہ آپ پُرانی کتابوں کا یہ کاروبار کتنے عرصے سے کر رہے ہیں؟ کہنے لگے "پینتالیس برس سے یہ خاکسار اس کام میں لگا اور عزت سے آج تک نبھ گئی، کل کا حال نہیں معلوم"

اس کے بعد بات چلی تو ذکر نکلا کہ پرانی اور قیمتی کتابوں کے تاجر کو گلی کوچوں سے، پُرانے رئیسوں کی حویلیوں سے، نوابوں کی ڈیوڑھیوں سے اور راجوں کے رجواڑوں سے قدیم کتاب کتنی مشکل سے ملتی ہوگی؟ اس پر نادر آغا بولے "بڑی مشکل سے ملتی ہے اور اس سے زیادہ مشکل سے بکتی ہے، سمجھے جناب؟ قرض بکتی ہے۔ عجیب و غریب باتیں ہیں، کیا آپ سے کہیں؟ کہاں تک کہیں؟"

جب کبھی وہ ریٹائر ہوں اپنے یہ رجسٹر انہیں دے دیں۔ میرے اصرار پر نادر آغا صاحب نے رجسٹر سے اپنا لکھا ہوا ایک اندراج پڑھ کر سنایا:

"کتاب کا نام ہے دشاد نامہ، تاریخ ہندوستان، منظوم، دو جلد۔ از بھوانی پرشاد شادؔ اور جانکی پرشاد۔ قلمی۔ خوش خط۔ پندرہ سطریں۔ کتاب کا آخری حصہ شاد کے بیٹے جانکی پرشاد نے پورا کیا۔ یہ کتاب ہندوستان کی ایک خاص اہم تاریخ ہے۔ کتاب کہیں کہیں سے چند ورق دیمک خوردہ ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں بمقام لکھنؤ تصنیف ہوئی۔ جلد اوّل کے شروع کے صفحات ناقص حالت میں ہیں۔ یہ کتاب اردو میں منظوم ہے۔ کئی ہزار ابیات ہیں۔ مختلف تاریخی کتابوں سے مصنف نے اقتباس کر کے یہ کتاب لکھی ہے۔ بھوانی پرشاد شادؔ آصف الدولہ کے عہد میں کم سن تھے۔ شاہی دربار سے تعلق تھا۔ اپنے چشم دید واقعات عہد آصف الدولہ سے لے کر عہد نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ تک قلمبند کئے ہیں اور یہ واقعات کسی دوسری تاریخِ اودھ میں نہیں ملتے ہیں۔ مصنف نے عہد نصیر الدین حیدر میں قضا کی۔ پھر ان کے بیٹے جانکی پرشاد نے اس کتاب کو ۱۲۶۹ھ میں ختم کیا اور تقریباً ۱۵۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ نایاب روزگار ہے"

ایک اور تاریخی کتاب کے مصنّف کے بارے میں نادر آغا صاحب نے بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد اپنے رجسٹر میں جو اندراج کیا ہے وہ ہم نے بھی پڑھا۔ لکھتے ہیں:

"ابراہیم سقّہ دمشق میں رہتے تھے۔ سقّے کا پیشہ تھا۔ پھر قسطنطنیہ میں تحصیلِ علم کی غرض سے قیام کیا۔ قرآن مجید خوش الحانی سے پڑھتے تھے، اس وجہ سے انکی کافی شہرت ہوئی اور وہاں جامع مسجد حضرت ابوایوبؓ کے امام مقرر ہوتے۔ وہاں چالیس برس رہ کر پھر دمشق میں آئے اور مدرسہ جوریہ میں مدرّس ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور ہاتھ پاؤں بھی آخر عمر میں بیکار ہو گئے تھے۔ اس حالت میں وہ بیان کیا کرتے تھے اور کافی لوگ اُن سے عقیدہ رکھتے تھے اور ہر شخص ان کی عزت

کرتا تھا۔ انہوں نے ۱۰۷۹ھ میں انتقال کیا۔"

یہ اقتباس سنا کر نادر آغا صاحب بولے "بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ چار سطریں تو میں نے پڑھ کر سنا دیں مگر یہ میں نے حاصل کیسے کیں؟ اس کو بس میں ہی سمجھتا ہوں کہ کتنی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں"

میں نے نادر آغا صاحب سے پوچھا کہ کتابوں کے متعلق اس تحقیق میں کیا ساری جستجو آپ تنہا کرتے ہیں یا اس میں کسی کا مشورہ بھی ہوتا ہے؟ کہنے لگے "پہلے بڑے بھائی کا مشورہ ہوتا تھا۔ اب تو کوئی مشورہ دینے والا ہی نہیں۔ سمجھتے ہی نہیں کتاب، مشورہ کیا دیں گے؟ اردو کی کتاب تو سمجھ نہیں سکتے تو فارسی اور عربی کی کتاب کو کیا سمجھیں گے؟۔ ہم خود نہیں سمجھتے۔ یہ صحیح کہتے ہیں آپ سے!

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے گھرانے میں اسی برس سے چلے آنے والے اس عظیم الشان کام کا مستقبل کیا ہے؟ اب اس ذمہ داری کو کون سنبھالے گا؟ میرا سوال سن کر وہ بجھ سے گئے، کہنے لگے "ہم کو افسوس ہے کہ ہماری کوئی اولاد اس لائق نہیں ہے، نہ ادھر توجہ کرتی ہے۔ ایک پڑھے لکھے صاحبزادے ہیں تو وہ کوئی توجہ نہیں کرتے۔"

میں نے نادر آغا صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہا کہ آپ نے علم، ادب اور تاریخ کے اس قیمتی سرمائے کی واقعی بڑی خدمت کی ہے۔ اب جو وہ بولے تو محسوس ہوا جیسے پورا لکھنئو بولا۔ ہنس کے کہنے لگے "کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ بدنام ہو گئے ہیں"

آخر میں میں نے کہا کہ آپ نے ان کتابوں کو بہت عزیز رکھا ہو گا۔ آپ ان کتابوں کی بڑی حفاظت کرتے ہوں گے۔ میری بات سن کر ضعیف کتب فروش نے سرہانے رکھی ہوئی کتابوں پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا۔

"جی ہاں۔ حفاظت تو کرتے ہیں مگر یہ کہ ہماری حد تک حفاظت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری اولاد سے نہ ہو سکے۔ ہم کو خود اپنے انجام کی فکر ہے کہ ہم نے ایک ایک کتاب کتنی محنت سے حاصل کی ہے اور اسکو محفوظ کر کے رکھا ہے، اب خدا جانے اسکا حشر کیا ہو گا۔"

کچھ کھویا کچھ پایا

تقریباً ایک سو سال ہوئے، مصر میں ایک چھوٹا سا قدیم مقبرہ کھولا گیا۔ اس میں ایک لڑکی کی میت، ایک پرانی کتاب پر سر رکھے چین کی نیند سو رہی تھی۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھا کر وہ کتاب نکالی گئی اور اس طرح یونان کے شاعر ہومر کی شہرۂ آفاق تصنیف ایلیڈ کا دوسرا حصّہ آج کے انسان کے ہاتھ لگا۔

مصر کے مقبروں، چین کے غاروں، دریائے نیل کے کنارے ہزاروں سال پرانے کوڑے کے انباروں اور یونان اور روم کی خانقاہوں سے قدیم علم کے وہ تمام ذخیرے ملے ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو ہم اگلے وقتوں کے حکیموں، مفکروں، شاعروں، مورّخوں اور ڈرامہ نگاروں کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔

کچھ یہی حال اپنے برِّصغیر کا رہا ہے۔ ہزاروں کتابوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں موجود تھیں لیکن یا تو آگ، سیلاب، دیمک اور جہالت نے اُنہیں مٹا ڈالا یا ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی کہیں موجود ہوں مگر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہوں۔ یہ باب کچھ کھو جانے اور کچھ

مل جانے والی کتابوں کا ہے۔

برصغیر میں پھیلی ہوئی خانقاہوں میں اب بھی قدیم کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں چھ سو سال پرانے شاعر ملّا داؤد کی مشہور ہندی نظم ’چنداین‘ بہار میں منیر شریف کی خانقاہ سے ملی تھی۔ ملّا داؤد امیر خسرو کے زمانے کے قریب ہوئے تھے اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی مثنوی چنداین کا تاریخ کی کتابوں میں ذکر تو ملتا تھا لیکن خود یہ مثنوی کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہندوستان کے ممتاز تاریخ داں پروفیسر سید حسن عسکری منیر شریف کی خانقاہ میں جایا کرتے تھے۔ باقی احوال پروفیسر صاحب نے خود سنایا:

”ایک روز ہم وہاں کے سجادہ نشین کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے ٹین کا ایک بکس منگوایا۔ اس بکس میں کچھ پاشان اوراق تھے۔ ان کی عبارت ہندی میں تھی اس لئے ہم پڑھ نہیں سکے لیکن اس کے سرنامے پر فارسی میں کچھ تھوڑا سا لکھا تھا۔ اُسے پڑھ کر ہم نے کہا کہ ارے یہ تو ملّا داؤد کی چنداین معلوم ہوتی ہے جس کا کہ بدایونی نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندی والوں کی مدد سے ہم نے اُس پر لکھا۔ ہر طرف اس کا شہرہ ہوا کہ چنداین مل گئی۔ چنداین مل گئی۔ مطلب یہ کہ اس قسم کی چیزیں ایسے مقامات پر موجود ہیں“

ہندوستان کے شاعروں کا ایک نامور اور مستند تذکرہ ’آفتاب عالمتاب‘ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ موجود تھا مگر گم ہو گیا۔ اور سنا ہے کہ پھر مل گیا ہے۔ اس کا احوال جناب مشفق خواجہ نے سنایا۔

”قاضی محمد صادق اختر لکھنؤ کے ایک شاعر تھے۔ رہنے والے تو وہ ہُگلی کے تھے لیکن لکھنؤ آ گئے تھے اور غازی الدین حیدر کے زمانے میں انہیں ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے آفتاب عالمتاب کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔

قاضی محمد صادق اختر کے ایک دوست تھے مولوی محمد یوسف جن کے پاس آفتاب عالمتاب کا ایک نسخہ تھا۔ بعد میں وہ بھوپال میں آگئے۔ وہاں آکر انہوں نے بھوپال کے شاہی خاندان کے افراد کے نام سے کچھ تذکرے لکھے اور ان کے پاس جو بہترین مواد تھا وہ تذکرہ روز روشن کے عنوان سے اور اپنے بیٹے کے نام سے لکھا یہ تذکرے چھپ بھی گئے البتہ آفتاب عالمتاب کا کہیں پتہ نہ چلا، تو اندازہ یہ ہوا کہ ان کے پاس جو نسخہ تھا، وہ ضائع کر دیا گیا۔ عمداً! بہر حال اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لیکن ابھی حال میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے جو دلّی یونیورسٹی میں ہیں مجھے خط لکھا کہ یہ تذکرہ مل گیا ہے۔ فرّخ آباد کے کسی رئیس کے پاس ہے۔"

یہ ہوئی آفتاب عالمتاب کی بات۔

ملّا غواصی دکن کے بڑے نامور شاعر گزرے ہیں۔ وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گولکنڈہ میں قطب شاہی دور میں موجود تھے اور ساتویں بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ سے بیجاپور تک دکنی شاعری کے میدان میں غواصی کا ڈنکا بج رہا تھا، مگر تین صدیوں کا سفر طے کر کے ان کی صرف تین مثنویاں ہم تک صحیح سلامت پہنچیں اور غواصی کے کلیّات کا نسخہ کہیں راہ میں مارا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اُردو کی تاریخ کا ایک پورا باب زمانے کی نگاہوں سے چھپ گیا، اور محقق کہنے لگے کہ ان کی تحقیق اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گی کہ اچانک ایک روز حیدرآباد ریڈیو سے اعلان ہوا اور دنیائے علم وادب میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ بقول شخصے "غواصی کی کلیّات علیم الدین لا لیا ہے۔"

میں دکن گیا تو علیم الدین صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔ اب ضعیف ہو گئے ہیں۔ پُرانی اور قیمتی کتابوں کے کاروبار میں عمر گزاری ہے اور کتنی ہی تاریخی دستاویزیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے لاکر اہلِ علم افراد اور اداروں کو فراہم کی ہیں۔

میں نے علیم الدین صاحب سے فرمائش کی کہ غواصی کا دیوان کیونکر آپ کے ہاتھ لگا، ذرا اس کی داستان ہمیں بھی سنائیے۔ یہ سوال سن کر بہت مسرور ہوئے اور اُس واقعے کی ذرا ذراسی تفصیل سناڈالی جس واقعے کی بدولت غواصی کا دیوان بیجا پور کے نالے میں بہنے سے بچ گیا اور دنیا میں اس کا جو واحد نسخہ ہے وہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہوگیا۔

تو علیم الدین صاحب کا وہ دلچسپ واقعہ پیش خدمت ہے، کچھ میری کتابی زبان میں اور کچھ اُن کے دکنی لہجے میں۔

شہادتوں سے پتہ چلتا تھا کہ ملّا غواصی کا دیوان کہیں موجود ضرور ہے۔ علیم الدین صاحب کہتے ہیں کہ وہ بیس سال سے اس کی تلاش میں تھے۔ ایک مرتبہ وہ حیدرآباد سے بیجا پور گئے اور وہاں اپنے ایجنٹ بانگی صاحب سے ملے۔ بانگی صاحب بیچارے علاقے بھر کی خاک چھاننے کے بعد جو پرانی کتابیں جمع کر کے لائے تھے وہ علیم الدین صاحب کے سامنے رکھیں تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ اُن میں کلیات غواصی کے دو چار ورق موجود ہیں۔ علیم الدین صاحب حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے اور بانگی صاحب سے پوچھا کہ یہ ورق تم کہاں سے لائے؟ بانگی صاحب نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ یہ پورا البتہ وہ صدرالصدور کی جاگیر سے لائے ہیں۔

علیم الدین صاحب فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ابھی اسی وقت صدّالصدور کی جاگیر پر چلو۔ بانگی صاحب نے بتایا کہ ان کی جاگیر بہت دور گاؤں دیہات کے علاقے میں ہے وہاں پہنچنے کے لئے پہلے ٹرین سے پندرہ میل دور جانا ہوگا اور وہاں سے سات میل پیدل چلنا ہوگا اور وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ مگر علیم الدین صاحب اَڑ گئے۔ جس وقت وہ ٹرین میں بیٹھے، سورج غروب ہونے والا تھا۔ اور جب گاڑی تلگی کے اسٹیشن پر پہنچی، اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور اسٹیشن بالکل ویران پڑا تھا۔ چاروں طرف کھیت اور جنگل تھے اور دور دور تک انسان کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ کیڑے اور جنگلی جانور شور مچارہے تھے۔ بانگی صاحب نے مشورہ دیا کہ صبح کو بستی میں چلیں گے، رات بھر یہیں اسٹیشن پر سو رہیں۔ مگر علیم الدین صاحب

نے کہا" میں ان کیڑوں کی آواز سے سو نہیں سکتا۔ معلوم نہیں یہاں کیا کیا ہے۔ سانپ ہے، بچھو ہے، کیا ہے کدھر ہے۔ میں تو نہیں سو سکتا۔ جہاں تک ہو سکے پیدل ہی چلیں گے۔"

آخر بانگی صاحب کو ہار ماننی پڑی۔ انہوں نے کہا کہ سڑک کے راستے گاؤں کا فاصلہ سات میل ہے، اگر کھیتوں کے اندر سے چلیں تو گاؤں قریب پڑے گا۔ کلیاتِ غواصی کے اشتیاق میں علیم الدین صاحب کھیتوں میں اتر گئے۔

جوار کی اونچی فصل تھی اور اس کے پتّے چاقو چھری کی طرح تیز تھے۔ علیم الدین صاحب نے اپنے ہاتھ بہتیرے شیروانی کی آستینوں میں چھپائے مگر وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ رات دو بجے یہ دونوں حضرات کوڑگی نامی گاؤں میں پہنچے جو صدر الصدور کی جاگیر ہے۔ گاؤں کے کتّے بری طرح بھونکنے لگے اور علیم الدین صاحب ڈرے کہ بستی والے اپنے گھروں سے نکل کر ان کی خبر لیں گے مگر بانگی صاحب انہیں پولیس چوکی کی عمارت میں لے گئے جو اس وقت خالی پڑی تھی البتہ آتش دان میں ایک بڑی سی لکڑی جل رہی تھی۔ دونوں نے باقی رات آتش دان کے سامنے گزار دی نیند علیم الدین صاحب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور انہیں تو بس صبح کا انتظار تھا۔ جوں ہی دن کا اجالا ہوا انہوں نے بانگی صاحب سے کہا" بھائی! وہ کون صاحب ہیں؟ کس کے پاس سے تم یہ ذخیرہ لائے تھے؟ ذرا اُن کو بلا کے لاؤ۔"

بانگی صاحب گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک صاحب کو بُلا لائے جو صدر الصدور کے رشتہ دار تھے۔ وہ کاندھے پر ناگل اٹھائے کھیتوں کو جاتے تھے۔ شہر سے آئے ہوئے، شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس علیم الدین صاحب کو دیکھا تو جھک کر سلام کیا۔ بہت ادب سے ملے اور مخصوص دکنی لہجے میں پوچھنے لگے" آپ کیا کھائے سو؟" اس پر بانگی صاحب نے جواب دیا" کاں کھائے سو۔ رات میں تو آئے۔"

مہمانوں کو بھوکا پا کر ان صاحب نے اپنا ناگل یعنی ہل وہیں پٹخا۔ دوڑے ہوئے اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر بعد آ کر مہمانوں کو اپنے ساتھ گھر لے چلے۔ وہاں جا کر علیم الدین صاحب کیا

دیکھتے ہیں کہ "دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ دہی ہے، بالائی ہے، پراٹھے ہیں اور انڈے ہیں"

علیم الدین صاحب رات بھر کے بھوکے تھے، اصولاً ڈٹ کر کھانا چاہیئے تھا۔ مگر ان کا دھیان تو کلیاتِ غواصی میں لگا ہوا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی اپنے ساتھی سے بولے "باگی صاحب، پوچھو تو سہی کہ کتابیں کہاں ہیں، کدھر ہیں؟" اس پر صدر الصدور کے ان عزیز نے جواب دیا۔ "میرے پاس بھوت کتابیں تھے۔ سب کنٹے میں بہا دیا ہوں۔ دو بوٹے وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ آپے چاہو تو دیکھ لو" یعنی میرے پاس بہت کتابیں تھیں مگر سب نالے میں بہا دی ہیں۔ صرف دو بوریوں میں بندھی ہوئی کچھ کتابیں پڑی ہیں۔ آپ چاہیں تو ملاحظہ فرمائیے۔"

علیم الدین صاحب اُس روز ندیدوں کی طرح ان بوریوں پر جھپٹے۔ میزبان نے کہا "آپ نے لے کر جاؤ" چنانچہ وہ دونوں تھیلے اٹھا کر واپس اسی پولیس چوکی میں آئے اور جلدی جلدی انہیں کھولا۔ علیم الدین صاحب کہتے ہیں "میں جب کھول کر دیکھا، ماشاءاللہ سے اس میں غواصی کے اوراق موجود ہیں، علی نامہ نُصرتی کا موجود ہے اُس میں"

اب علیم الدین صاحب نے اپنے میزبان کو ان بیش قیمت کتابوں کا معاوضہ پیش کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ اس کے کچھ پیسے لے لیجئے۔ جواب ملا "نکو نکو نکو۔ آپ لے کے جاؤ سب کنٹے میں بہا دیا ہوں۔ یہ بھی کنٹے میں بہا دینے کا تھا"

غرض یہ کہ بڑی مشکل سے اور حجّت کے بعد انہوں نے ساٹھ روپے قبول کئے اور مہمانوں کو اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کر اسٹیشن تک چھوڑا۔ اس وقت علیم الدین صاحب کا جی چاہتا تھا کہ پر لگیں اور وہ اڑ کر حیدر آباد پہنچیں۔ بہر حال وہ گاؤں سے بیجاپور اور بیجاپور سے حیدر آباد پہنچے۔ غواصی کا دیوان ابھی ان کے بغل ہی میں تھے کہ شہر میں ڈھنڈورا ہوگیا کہ خود علیم الدین صاحب کے بقول "غواصی کا کلیات علیم الدین لا لیا ہے"

یہ خبر سنتے ہی سالار جنگ نے نواب سعادت علی خاں کو بھیجا کہ وہ علیم الدین صاحب سے کلیات لے آئیں اور منہ مانگی قیمت دے دیں۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ان دنوں دلّی میں

تھے۔ انہوں نے فوراً علیم الدین صاحب کو لکھا کہ کلیات کسی اور کو نہ دینا میں پانچ ہزار روپے بھیج رہا ہوں۔

مگر علیم الدین صاحب ٹال مٹول کرتے رہے اور کلیات کا نسخہ لے کر علامہ عمادی کے پاس پہنچے جو عربی کے بڑے عالم تھے اور دار الترجمہ کا ایک اہم ستون تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں کلیاتِ غواصی کو کتب خانہ آصفیہ میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں وزیر اعظم نواب مہدی یار جنگ سے اجازت لے کر کتب خانے کی کمیٹی کا اجلاس طلب کر رہا ہوں اور کمیٹی کے اختیارات میں جتنی بھی رقم ہو گی، تمہیں دلاؤں گا۔

دوسرے روز کمیٹی بیٹھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کتاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مگر کمیٹی کے اختیارات محدود تھے۔ وہ تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں دے سکتی تھی۔ عمادی صاحب نے علیم الدین صاحب کو بلایا اور انہیں سمجھایا کہ کمیٹی بے بس ہے ورنہ تمہیں بہت زیادہ رقم دی جاتی۔ اس وقت یہی تین ہزار روپے قبول کر لو، البتہ آئندہ کمیٹی تمہارا خاص خیال رکھے گی۔

علیم الدین صاحب نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

کلیاتِ غواصی اب آندھرا پردیش آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

دنیا میں اس کا بس یہی ایک نسخہ ہے۔

اور آخر میں دیوانِ غالبؔ کے اُس تاریخی نسخے کا احوال جو نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ دیوانِ غالبؔ کا یہ نسخہ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا جب غالبؔ صرف پچیس برس کے تھے۔ پھر یہ نسخہ ۱۹۱۵ء کے قریب بھوپال میں کتب خانۂ حمیدیہ یعنی نواب صاحب کی لائبریری سے نکل آیا۔ اس کی اشاعت ہوئی اور تقریباً تیس سال تک محفوظ رہ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دیوانِ غالبؔ کے اس نسخۂ بھوپال کے متعلق وہاں اردو کے استاد اور محقق جناب عبدالقوی دسنوی بتا رہے تھے۔

" یہاں جو نواب صاحب کی لائبریری تھی جہاں نسخہ بھوپال تھا اور وہ وہاں سے

لاپتہ ہو گیا۔ پتہ نہیں کہاں ہے، وہیں، جیسا کہ مجھے اطلاع ملی ہے، عربی فارسی
کے بھی کافی نسخے تھے لیکن اب تک ان کا علم نہیں ہے۔ میں خود تلاش میں ہوں
کہ کچھ چیزیں وہاں سے دستیاب ہو جائیں۔ وہ یا تو کسی صندوق میں بند ہیں یا کسی
ایسے کمرے میں بند ہیں جہاں لوگ جا نہیں رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نسخۂ بھوپال
بھی وہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔"

ایسی باتیں سن کر ہم جی ہی جی میں پوچھتے ہیں کہ محل میں کتابیں موجود ہوں اور خود محل
والوں کو اُن کا علم نہ ہو یا اُن کا خیال نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے؟
اندر کہیں سے ایک سہما سہما سا جواب آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے!

غالبؔ کوئے ملامت میں

گزشتہ باب میں دیوانِ غالبؔ کے کھوئے جانے کی بات ہو رہی تھی۔ اس باب میں بھی ہم اُسی کوئے ملامت کو جا رہے ہیں۔

سات اپریل، اُنّیس سو اُنہتر کی صبح دلّی کے ایک اردو روزنامے میں یہ اشتہار شائع ہوا۔

مرزا غالبؔ کی تحریر دستیاب۔

ضروری اطلاع

ہر خاص و عام کو اور حکومتِ بہار، خصوصاً حاجی عبدالحمید صاحب، مالک ہمدرد دواخانہ دہلی، اور وہ ادارے جو غالبؔ کے لٹریچر یا اس کی تحریر سے دلچسپی رکھتے ہوں، یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ میرے پاس مرزا غالبؔ کی خودنوشت بیاض، غیر مطبوعہ موجود ہے۔ اس کی خریداری کے لئے مجھ سے ملیں یا خط و کتابت کریں۔

نوٹ:۔ بیاض کی قیمت کم سے کم چھ ہزار روپے ہوگی۔ توفیق احمد قادری چشتی، امروہہ، ضلع مرادآباد۔

عین ان دنوں جب دنیا بھر میں غالبؔ کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں، امروہہ سے پُرانی کتابوں کے تاجر توفیق احمد صاحب کا یہ اعلان ایک دھماکا ثابت ہُوا کہ انہیں ایک ایسا دیوانِ غالبؔ مل گیا ہے جو خود غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی ایسا دیوان جو کبھی شائع نہیں ہوا۔ توفیق احمد صاحب نے خود اس نادر روزگار بیاضِ غالبؔ کی قیمت چھ ہزار روپے لگائی اردو کی تاریخ میں غالبؔ کی نسبت سے یہ ایک بہت بڑا اور اہم واقعہ تھا۔ ہندوستان کے خبر رساں اداروں نے یہ خبر ساری دنیا میں پھیلا دی۔ بیاضِ غالبؔ کی دھُوم مچ گئی۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ کچھ عرصے بعد دلّی اور لاہور سے بیاضِ غالبؔ کے عکس بھی شائع ہو گئے۔

اب ضرورت تھی کہ بیاضِ غالبؔ کے اصل نسخے پر ماہرین کی تحقیق شروع ہو اور غالبؔ کی شاعری پر پڑے ہوئے باریک اور دبیز سارے ہی پردے اٹھیں مگر ڈرامے کا پردہ جتنی شان سے اٹھا تھا اتنی ہی خاموشی اور پُراسرار خاموشی سے گر پڑا۔ دیوانِ غالبؔ لاپتہ ہو گیا۔ اور یہ حال اب کسی حال نہیں کھلتا کہ وہ کہاں ہے، کس کے پاس ہے، کون اُسے چھپاتے بیٹھا ہے۔ اور اس چھپانے میں مصلحت کیا ہے؟

اب ہم اس داستان کو شروع سے دُہراتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کہانی کے مختلف کردار خود کیا کہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم امروہہ کے توفیق احمد قادری چشتی صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھا کہ انہیں بیاضِ غالبؔ کا یہ یکتائے روزگار نسخہ کہاں سے اور کیسے ہاتھ لگا۔؟

انہوں نے کہا: "ایک مخطوطہ، نسخہ غالب بخطِ غالبؔ ۵؍اپریل ۶۹ء کو میں نے بھوپال سے گیارہ روپے کا خریدا تھا۔ میں یہاں سے تقریباً سات آٹھ ہزار روپے کی پونجی لے کر بھوپال گیا۔ وہاں جانے کے بعد وہاں کے کباڑیوں سے میری ملاقات ہوئی ایک کباڑی نے مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو کتاب دلوائیں گے۔ وہاں ایک پرانی کتابوں

کا بیوپاری تھا اس نے کہا ہم کو اپنی کتابیں دکھائیں۔ جب اس نے اپنی الماری کھولی تو بہت سی کتابیں نکلیں۔ دیوانِ غالبؔ بھی نکلا۔ اب ہم نے سب سے پہلے دیوانِ غالب پر ہاتھ نہیں رکھا بلکہ ہر کتاب کو پوچھتے چلے گئے۔ یہ ہمارا تجارتی گُر تھا۔ اور آخر میں ہم نے اُن سے پوچھا کہ اس کتاب کی کیا قیمت مانگتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ بتائیں۔ ہم نے کہا آپ بتائیے۔ اس پر ہم نے وہی تاجرانہ گُر اختیار کیا اور کہا کہ ہمارے ہاں ایک اصول ہے کہ بیٹے کا نام باپ ہی رکھتا ہے۔ آپ اس کی قیمت بولئے۔ انہوں نے اولاً پچیس روپے طلب کئے۔ ہوتے ہوتے دس روپے پر سودا ہوا۔ اور ایک روپیہ انہوں نے اُوپر لیا ہم سے۔"

میں نے توفیق احمد سے پوچھا "کیا آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کتاب کتنی اہم ہے؟"

جواب ملا "جی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا۔"

امروہہ کے توفیق احمد صاحب کی اس روایت کی تصدیق کرنے ہم بھوپال پہنچے اور اُن تاجر کُتب کی تلاش شروع کی جن سے توفیق صاحب نے یہ دیوانِ غالبؔ خود ان کے بقول صرف گیارہ روپے میں خریدا تھا۔

بھوپال میں ہم نے ایک صاحب، جناب محمود حسن کو ڈھونڈ نکالا جو نہ صرف ان تاجر کتب سے بلکہ اس دیوان غالبؔ کے معاملے سے بھی واقف تھے۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ امروہہ کے توفیق احمد صاحب کو یہ دیوان غالبؔ کس نے دیا تھا؟

جواب ملا "شفیق الحسن صاحب نے۔ اُن کو یہ نسخہ ابراہیم پورے میں ایک پٹھان کباڑی کے ہاں سے ردی میں مل گیا تھا اور پھر انہوں نے امروہے کے تاجر کو دیا تھا۔"

اب ہم شفیق الحسن صاحب کی تلاش میں نکلے۔ قاری ہیں، بھوپال کی ایک مسجد میں ملے۔ ہم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ امروہہ کے توفیق احمد صاحب آپ سے بیاض غالبؔ صرف گیارہ روپے میں لے گئے تھے؟ شفیق الحسن صاحب نے کہا "وہ تو میں نے مزید تحقیق اور تصدیق کے لئے

انہیں عاریتاً اور امانتاً دی تھی۔ اسے وہ گیارہ روپے کی ایک کتاب کے اندر رکھ کر لے گئے تھے۔"

ہم نے کہا کہ وہ تو یہ بتاتے ہیں کہ آپ نے پچیس روپے مانگے تھے لیکن معاملہ گیارہ روپے پر طے ہو گیا۔ اس پر شفیق الحسن صاحب نے کہا" یہ واقعے کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے کہ انہوں نے "تاریخ ٹونک"، مطبوعہ، گیارہ روپے میں مجھ سے خریدی تھی۔ اس میں یہ اوراق غیر مجلّد رکھ کر وہ بدھوارا میں اسمٰعیل صاحب کے پاس لے گئے جن کا وہاں کتاب گھر ہے، اور ان کو دکھلایا۔ اسمٰعیل صاحب نے برسبیل تذکرہ ان سے دریافت کیا کہ یہ کتنے میں لائے تو انہوں نے یہی کہا کہ گیارہ روپے میں خرید کر لایا ہوں۔ مفتی نورانی صاحب بھی اتفاق سے وہیں بیٹھے تھے چنانچہ وہ سمجھے کہ یہ سب گیارہ روپے میں خرید لایا ہے جبکہ وہ مخطوطہ عاریتاً اور امانتاً دیا گیا تھا، فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں صریح غلط بیانی ہے جس کا وہ بعد میں اعتراف بھی کر چکے ہیں۔ اور نیاز مند قاری شفیق الحسن خاں کے نام ملک ہونا بھی عدالت میں تسلیم کر لیا ہے۔"

"گویا قانوناً اس کے مالک آپ ہیں؟"

"جی ہاں۔ قانوناً میں ہی اس کا مالک ہوں۔"

اس دعوے کی تصدیق کے لئے ہم نے امروہہ کے توفیق احمد صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ طے ہو چکا ہے کہ بیاضِ غالبؔ کا اصل مالک کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔" جی ہاں، مالک طے ہو چکا ہے۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ اس کا مالک میں ہوں اور مولانا عرشی کے صاحبزادے سے میرا ایگریمنٹ ہوا تھا۔ انہیں تسلیم ہے بلکہ تمام دنیا تسلیم کرتی ہے کہ اس کا مالک توفیق احمد ہے۔"

یہاں سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے صاحبزادے یعنی رام پور کے اکبر علی خاں عرشی زادہ بھی اس داستان میں شامل ہو گئے۔ عرشی زادہ صاحب تقریباً بیس برسوں سے غالب کے قلم کی تمام تحریروں کے عکس جمع کر رہے ہیں۔ اور اب تک کوئی ایک ہزار تحریریں جمع کر چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسٹیٹ آرکائیوز، الہ آباد کے جلال الدین صاحب امروہہ سے بیاضِ غالب کے چند صفحوں کے فوٹو اتار کر عرشی صاحب کو دکھانے لائے۔ مولانا نے وہ عکس بیٹے کو دکھائے چنانچہ عرشی زادہ

کہتے ہیں۔" وہ جن صفحات کے فوٹو لاتے تھے اُن میں آخری صفحے یعنی ترقیمے کا فوٹو بھی تھا جو ذرا زیادہ صاف بھی تھا۔ اُس میں اسد اللہ خاں جہاں لکھا ہوا تھا میں نے اُسے دیکھا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا غالبؔ کے خط میں ہونا چاہیئے۔"

اب اکبر علی خاں عرشی زادہ صاحب کی دلچسپی بڑھی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ پھر امروہہ میں توفیق احمد صاحب تک آپ کی رسائی کیسے ہوئی اور بیاضِ غالبؔ کا اصل نسخہ آپ کو کیسے ملا؟۔ انہوں نے بتایا" اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے سرور صاحب نے علی گڑھ سے لکھا کہ بھئی تم اتنے عرصے سے غالبؔ کی تحریروں پر کام کر رہے ہو۔ ذرا تم امروہہ تک چلے جاؤ اور جا کر دیکھو کہ یہ بیاض واقعی غالبؔ کے قلم کی ہے یا نہیں؟۔ اس طرح میرے شوق کو مہمیز ہوئی اور میں دوسرے ہی دن امروہہ پہنچ گیا۔ وہاں توفیق احمد صاحب سے جو اس کے مالک تھے وہ مخطوطہ دیکھا۔ وہ میرے ساتھ یہاں رام پور آ گئے۔ آبا نے بھی دیکھا۔ میں نے اس سے نوٹس تیار کئے۔ وہ میرے پاس ہی چھوڑ گئے اور پھر یہ طے ہوا کہ ہم اسے شائع کر دیں تاکہ اس کی معلومات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائیں۔"

اس واقعے کے پانچ مہینے بعد یہ دیوان غالبؔ دہلی سے نسخۂ عرشی زادہ کے عنوان سے شائع ہو گیا۔ اس کے صرف چند سو نسخے چھاپے گئے اور فی نسخہ قیمت تین سو روپے مقرر کی گئی۔ یہاں سے کچھ اور دلچسپ واقعات شروع ہوتے ہیں۔ تقریباً اُن ہی دنوں پاکستان کے مشہور ادبی جریدے نقوش کا غالبؔ نمبر چھپا جس میں اُسی بیاضِ غالبؔ کا وہی سارا کا سارا عکس نسخۂ لاہور کے عنوان سے موجود تھا۔ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ اب شور اٹھا کہ بیاضِ غالبؔ اسمگل ہو کر پاکستان چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ آواز اٹھی کہ یہ بیاضِ غالبؔ اصلی نہیں، کسی جعلساز کا کارنامہ ہے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد اور محقق انصار اللہ صاحب نے اور بعد میں ادارۂ مطالعات غالبؔ سری نگر کے کمال احمد صدیقی صاحب نے دعویٰ کیا کہ بیاضِ غالبؔ کا مخطوطہ جعلی ہے۔ اور ابھی امروہے کے توفیق احمد صاحب نے جو اپنی اس دریافت سے بھاری منافع پانے کی توقع کر رہے تھے

اپنا حصّہ طلب کرنا شروع کیا ہی تھا کہ بیاضِ غالبؔ کا اصل نسخہ لاپتہ ہوگیا۔ ہم نے توفیق احمد صاحب سے پوچھا کہ نسخے کا کیا ہوا؟ انہوں نے کہا" جب عرشی زادہ صاحب نے میری کتاب چھاپی تو نہ تو اُس کا معاوضہ مجھے دیا اور نہ ہی میرا دیوان اب تک لوٹایا جو اُن کے ناجائز قبضے میں اب تک موجود ہے "

اس پر ہم نے عرشی زادہ صاحب سے پوچھا کہ دیوان غالبؔ کا اصل مخطوطہ کس کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے کہا" میں حتمی طور پر تو نہیں بتا سکتا۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے اس کے مالک توفیق احمد صاحب کو واپس کر دیا تھا۔ انہوں نے ڈاک کے ذریعے، کارڈ پر مجھے اس کی رسید بھیجی تھی، وہ میرے پاس آج بھی محفوظ ہے "

چونکہ اُسی دوران بیاض غالبؔ کا عکس پاکستان میں بھی شائع ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں ایک قیاس آرائی یہ شروع ہوئی کہ کسی نے بھاری رقم لے کر وہ نسخہ چوری چھپے ملتان میں انگریزی کے استاد اور غالبیات کے ایک ماہر لطیف الزمان خاں صاحب کو پہنچا دیا۔ لطیف الزمان صاحب نے اُسے نقوش کے مدیر محمد طفیل صاحب کے حوالے کیا جنہوں نے راتوں رات، بلکہ دہلی کے نسخہ عرشی زادہ سے بھی پہلے ہی شائع کر دیا۔ اس پر ہم نے ملتان کے جناب لطیف الزماں خاں صاحب کو لکھا کہ یہ تاریخی کتاب آپ تک کیونکر پہنچی؟ انہوں نے جواب میں لکھا۔

" دہلی میں جو فوٹو گرافر عرشی زادہ صاحب کے لئے بیاض غالبؔ کے مختلف صفحات کے فوٹو اسٹیٹ تیار کر رہا تھا اس نے بھی اندازہ کر لیا کہ قیمتی نسخہ ہے، اس نے بھی فوٹو اسٹیٹ ۴۲ صفحات کے اپنے پاس محفوظ رکھے۔ یہی صفحات میرے ایک عزیز نے بھاری قیمت دے کر خریدے اور مجھے بھیجے اور میں نے طفیل صاحب کو ملتان بلا کر یہ صفحات سپرد کر دیئے۔ اس طرح طفیل صاحب نے بیاض غالب بخطِ غالبؔ شائع کی "

اسی دوران بیاض غالبؔ کی صداقت پر شبہ ظاہر کیا جانے لگا۔ کمال احمد صدیقی صاحب نے " بیاض غالبؔ، تحقیقی جائزہ "، کے عنوان سے چار سو ستاسی صفحوں کی ایک پوری کتاب صرف یہ

ثابت کرنے کے لئے شائع کر دی کہ بیاضِ غالبؔ کا یہ نسخہ جعلی ہے اور بخط غالب نہیں۔ ہم نے لطیف الزماں خاں صاحب سے پوچھا کہ خود آپ نے اس بارے میں کچھ تحقیق کی ہے انہوں نے جواب میں لکھا۔

"میں نے کالی داس گپتا رضاؔ صاحب کو، جو غالبؔ کے عاشق ہیں۔ بمبئی خط لکھا کہ وہ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ رضا صاحب کا خیال ہے کہ مخطوطہ جعلی نہیں ہے اور یہ کہ کمال احمد صاحب صدیقی تحقیق کے آدمی نہیں ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مخطوطہ جعلی ہے۔"

ہم نے ادارہ یادگار غالب، کراچی کے جناب مرزا ظفر الحسن صاحب کو لکھا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ ان کا جواب آیا۔

"جب کمال احمد صدیقی نے اتنی مفصل اور جامع کتاب بیاضِ غالبؔ کے خلاف لکھ دی تو اب وہ لوگ جنہوں نے بیاضِ غالبؔ کی تعریف میں زبردست خطبات دیئے تھے خاموش کیوں ہو گئے، انہوں نے جواب میں کچھ لکھا کیوں نہیں۔"

اس کے تین جواب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اعتراض کرنے والے تحقیق کے میدان میں آتنے مستند نہیں کہ مانے ہوئے محقق ان کے جواب دیتے پھریں۔ یا پھر اعتراضات پڑھ کر انہیں بھی یقین ہو چلا ہے کہ بیاضِ غالبؔ کا نسخہ جعلی ہے۔ یا یہ کہ اس داستان کے کسی کردار کی نیّت ٹھیک نہیں رہی اس لئے اب کسی کو کیا پڑی ہے کہ بیاضِ غالبؔ کی حمایت میں زبان کھولے اور ایک ایسی شے کی وکالت کرے جو نہ معلوم کہاں، کسی کی تاریک الماری میں بند ہے اور جس کے بارے میں اب یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید ہمیشہ بند رہے گی۔

جہاں رہے سلامت رہے

یہ بتائیے کہ کیا آپ کے گھر میں باپ داداکے زمانے سے چلی آنے والی پُرانی کتابیں موجود ہیں؟ کیا اُن میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں؟ کہیں وہ بکسوں یا الماریوں میں بند تو نہیں پڑی ہیں؟ پڑی ہیں تو کیا آپ انہیں کبھی کبھار دن کی روشنی دکھاتے رہتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے انہیں کیڑوں مکوڑوں سے اور گلنے سڑنے سے بچانے کے لئے کچھ کیا ہے یا نہیں؟ کیا آپ کتابوں کو احتیاط سے رکھنے کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اپنی قدیم اور قیمتی کتابوں کو کسی بڑے کتب خانے میں جمع کرا دیں جہاں وہ طویل عرصے کے لئے محفوظ ہو جائیں اور آپ کی یادگار بن کر باقی رہ جائیں؟

اگر آپ نے گزشتہ اوراق پر نگاہ ڈالی ہے تو اس قسم کے سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہوں گے۔ آپ کی نمائندگی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے سوال ہم نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب سے پوچھے جن کی عمر کا بڑا حصّہ کتب خانوں اور آرکائیوز میں ریسرچ کرتے گزرا ہے۔ انہوں نے غریب گھرانوں میں، رئیسوں کی حویلیوں میں، لائبریریوں اور سرکاری دفتروں

میں ان گنت کتابیں اور بے شمار دستاویزیں دیکھی ہیں، ان کی حالت دیکھی ہے۔ ان کے مسائل دیکھے ہیں اور ان مسائل کے حل پر غور کیا ہے۔ ہم نے ڈاکٹر شکیب سے پوچھا کہ آپ نے عام لوگوں کے گھروں میں جو کتابیں دیکھی ہیں، کیا وہ محفوظ ہیں یا ان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے؟ جواب ملا۔

"ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تو عام طور پر جو رجحان ہے وہ یہ کہ اب وہاں کی معیشت اور زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا ہے۔ فرد کی گرفت میں اب زیادہ چیزیں نہیں رہیں۔ اب تو زیادہ تر چیزیں عوام کی گرفت میں آرہی ہیں۔ وہ دن نہیں رہے جب بڑے بڑے نواب اور اُمرا، اور جاگیردار ہوتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے مکان تھے جن میں کتب خانے تھے۔ ملازمین تھے۔ سہولتیں تھیں اور وسائل تھے۔ وہ کتابیں اکٹھا کرتے تھے۔ اور ان کی حفاظت کر سکتے تھے لیکن اب معاشرے اور حیثیت دونوں میں ایسا بڑا فرق آیا ہے کہ فرد کے بس میں یہ نہیں رہا کہ وہ ان کتابوں کو محفوظ کرے۔"

ہم نے پوچھا کہ عام لوگوں کے گھروں میں آپ نے کیسی کیسی چیزیں دیکھیں، اور کیا آپ نے ان چیزوں کے مالکوں کو ان کی اہمیت اور بچانے کی ضرورت سے باخبر پایا؟ ڈاکٹر شکیب نے جواب دیا۔

"وہ مخطوطے جو خوشنویسی، خطّاطی اور علم و ہنر کے نادر مرقعے ہیں جن کا ایک ایک صفحہ ایسا ہے کہ اس کو کسی میوزیم میں آویزاں کیجئے تو وہاں کی رونق بڑھ جائے مگر ان کا حال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو ان کی اہمیت کا احساس نہیں یا احساس ہونے کے باوجود یہ معلوم نہیں کہ ان کا تحفظ کیسے کریں۔"

اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر شکیب سے اُن کی رائے پوچھی کہ جو افراد یا چھوٹے اور نجی ادارے پرانی کتابوں کے ذخیرے لئے بیٹھے ہیں اور اب اس ورثے کو بچانا اُن کے لئے دشوار ہوتا

جارہا ہے، ان لوگوں یا اداروں کے لئے کیا بندوبست ہونا چاہیئے ؟ انہوں نے کہا۔

"یہ بہتر ہے کہ ان کی انجمنیں بنائی جائیں۔ جن کو ذمّہ دار اور بزرگ لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے اور اس کے ایسے قوانین بنائے جائیں کہ یہ ادارے ہمشہ ذمّہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں۔"

برِصغیر میں چھوٹے کتب خانے بہت سے ہیں جو بظاہر چھوٹے ہیں مگر علم کے شاندار ذخیرے ان کی تحویل میں ہیں۔ ایسے کتب خانوں کو کہاں لے جایا جائے ؟ ان کا کیا کیا جائے ؟

"ہونا یہ چاہیئے کہ جہاں ایسی عمارتیں اور تحفّظ کے وسائل اور کتابوں کو رکھنے والے اور ان کی مرمت کرنے والے ماہرین موجود ہوں، چھوٹے کتب خانوں کو اُن میں ضم کر دینا چاہیئے۔"

مگر یہ افراد اور یہ ادارے اور چھوٹے کتب خانے اپنے اس سرمائے پر ناز کرتے ہیں اور اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اپنی کتابیں کسی بڑے ادارے کو دے دیں گے تو کیا وہ اپنے اثاثے سے محروم نہیں ہو جائیں گے ؟

"بہتر یہ ہوگا کہ ایسے ادارے بنائے جائیں جن میں مختلف چھوٹے اداروں کو ان کے اپنے حق ملکیّت اور حقِ تحفّظ برقرار رکھتے ہوئے اپنی چیزوں کو وہاں محفوظ کرانے کا اختیار ہو جیسے بینک میں لے جا کے ڈپازٹ کرتے ہیں۔ یہ ادارے بھی اپنے مخطوطے وغیرہ وہاں جمع کرا دیں اور اس بات کی اجازت ہو کہ کتب خانے کے ماہرین ان کی مرمّت کریں اور ان کی تصویریں بنوائیں اور ریسرچ اسکالر اُن سے استفادہ کر سکیں۔"

آخر میں ہم نے ڈاکٹر ضیاءالدین احمد شکیب سے پوچھا کہ برِصغیر کے گھرانوں میں اور کتب خانوں میں جو پُرانی کتابیں اور دستاویزیں محفوظ ہیں ان کا، آپ کے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اور اس مسئلے کا حل کیا ہے ؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"فارسی کے جو قدیم شکستہ کے اسالیب ہیں، ان کے جو نظم و نسق کے محاورے اور اصطلاحات ہیں وہ اب لوگوں کی گرفت سے نکلتے جا رہے ہیں۔ اس پر نہ کوئی مناسب ریسرچ پروجیکٹ ہیں نہ اس کو جاننے والے ہیں۔ اکثر دفتروں آرکائیوز ریکارڈ کے آفس اور کتب خانوں کا یہ حال ہے کہ وہاں لوگ بیٹھے ہیں اور ان کے پاس ہزاروں، لاکھوں اسناد ہیں لیکن ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ بس ان پر نمبر پڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرح یہی حال یورپ کے بعض ملکوں میں ہے۔ مثلاً ہنگری میں فارسی کا سب سے قدیم ریکارڈ ہے لیکن اس کے ڈبوں پر انہوں نے نمبر ڈال دیئے ہیں لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ اُن کے اندر کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں قلمی کتابیں اور اسناد اُس وقت تک محفوظ نہیں ہو سکتیں جب تک وہاں کی جامعات میں قدیم زبانوں کے رسم الخط، محاورے اور مسائل کے لئے باقاعدہ نصاب میں کوئی چیز شریک نہ کی جائے۔ ضروری ہے کہ لوگ قدیم رسم الخط پڑھیں اور قدیم اسناد کی پہچان پیدا کریں۔ یہ بھی ایک فن ہے جس کو زندہ کریں۔ اگر کوئی شخص کوئی کتاب یا دستاویز اٹھائے اور اسے کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہ سیدھا اٹھائے ہوئے ہے یا اُلٹا اٹھائے ہوئے ہے تو وہ اس کا تحفظ نہ کر سکے گا۔"

یہ ہوئی آندھرا پردیش کے ڈاکٹر شکیب کی رائے۔ بھوپال کے جناب عبدالقوی دسنوی نے خود اپنے گاؤں دسنہ کی مثال دی جو بہار میں پٹنہ کے قریب ہے۔ وہاں بہت بڑا کتب خانۂ الاصلاح تھا جس میں بہت سے نادر مخطوطے بھی تھے۔ لیکن جب دسنہ والوں نے محسوس کیا کہ اب اس کتب خانے کی حفاظت کرنا دشوار ہے تو اس کا سارا قیمتی حصہ پٹنہ میں خدا بخش لائبریری میں منتقل کر دیا۔ دسنوی صاحب نے بتایا کہ اس کے بعد وہاں ایک روش چل گئی اور ذاتی کتب خانے اور دوسرے چھوٹے کتب خانے رضاکارانہ طور پر خدا بخش لائبریری میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ صوبے میں ہے لیکن مرکزی حکومت اُسے لاکھوں روپے

دے رہی ہے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ حکومت ہر صوبے میں کم سے کم ایک بڑی لائبریری کو وسائل دے کر ایسا بنادے کہ کتابوں کا وہ سارا سرمایہ جو ادھر اُدھر بکھرا ہوا ہے اس میں جمع ہو سکے۔ وہاں مائیکرو فلمنگ اور زیروکس کاپی کا اچھا بندوبست ہو۔ جو لوگ اپنے باپ دادا کی کتابیں خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے ان کی کتابوں کے عکس اتار کر وہاں محفوظ کر لئے جائیں۔ اور ایک انتظام یہ بھی ہونا چاہیئے کہ قدیم اور کار آمد کتابوں اور دستاویزوں پر کیمیاوی عمل کی اور جھلّی چڑھانے کی اور مرمّت کی سہولتیں عام لوگوں کے لئے کھلی ہوں۔ جو چاہے اپنی کتابیں وغیرہ لاکر اور کچھ معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ اپنی قدیم دستاویزوں وغیرہ پر کیمیاوی عمل کرالے اور انہیں محفوظ کرالے۔

میں نے اس سلسلے میں اپنے بزرگوں کے روّیے میں شدّت پائی۔ اپنی طویل عمر میں انہوں نے کتنے ہی کتب خانے ضائع ہوتے دیکھے چنانچہ برصغیر کی بعض کتابوں کے برطانیہ چلے جانے پر انہیں افسوس نہیں۔ مثلاً اورنگ آباد کے بزرگ شاعر جناب سکندر علی وجد نے کہا۔ "اگر ہماری کتابیں یہاں سے چلی جائیں تو مجھے کوئی غم نہیں کہ وہاں محفوظ تو رہیں گی۔ یہاں محفوظ نہیں رہنے والی ہیں"۔ پٹنہ کے ممتاز تاریخ داں پروفیسر حسن عسکری صاحب نے کتب خانوں کے مٹ جانے کا احوال بیان کرنے کے بعد کہا۔ "اسی وجہ سے ہم کہہ رہے ہیں کہ انگریزوں کا بڑا احسان ہے کہ وہ ہماری کتابیں لے گئے"۔

پھر گزشتہ دنوں پاکستان کے سرکردہ دانشور اور انشا پرداز جناب قدرت اللہ شہاب لندن تشریف لائے۔ ہم اپنے بزرگوں کے خیالات کی بات اُن سے کر رہے تھے تو انہوں نے بھی اپنی رائے ظاہر کی اور فیلڈ مارشل محمد ایوّب خاں مرحوم اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی ملاقات کا دلچسپ واقعہ یوں سنایا۔

"انڈیا آفس لائبریری میری بڑی محبوب لائبریری ہے۔ وہاں سے میں نے بڑا استفادہ کیا ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ہی یہ سوال

پیدا ہوا کہ اس لائبریری کا بٹوارہ کر کے اسے دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تو اس پر باقی دوسرے معاملات کی طرح بحث شروع ہو گئی۔ ۱۹۶۱ء میں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے، جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے، ملاقات کی درخواست کی جو مانی گئی۔ اس کے بعد دلّی کے پالم ایئرپورٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں ان کا ہمرکاب تھا اور اس میٹنگ کا ریکارڈ لکھنے کے لئے ان کے ساتھ موجود تھا۔ اس موقع پر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے کشمیر سمیت ہندوستان اور پاکستان کے مسائل بیان کئے اور ان مسائل پر اپنا رویہ تفصیل سے بیان کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو غور سے سنتے رہے اور سننے کے بعد ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ شاید ان مسئلوں پر اب کوئی دو ٹوک جواب دیں گے لیکن انہوں نے سر اُٹھا کر کہا: "فیلڈ مارشل: انڈیا آفس لائبریری کا کیا ہوگا؟" اس موضوع پر ایوب خاں صاحب کو پاکستان سے چلنے سے پہلے کسی نے بریف نہیں کیا تھا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا تم اس کا جواب دو۔ تو میں نے کہا "سر! آپ دونوں سے میری درخواست ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ یہ جہاں ہے وہیں رہے اور دونوں ممالک اپنے اپنے اسکالرز کو اور طالب علموں کو وظیفے دیں کہ وہ وہاں جا کر اُس سے استفادہ کریں۔"

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اہم بات یہ نہیں کہ کتاب کہاں رہے؟ اہم بات یہ ہے کہ جہاں بھی رہے، سلامت رہے۔

کڑی گم ہو جاتی ہے

یہ ایک یونیورسٹی کا ذکر ہے۔

میں لائبریری دیکھنے گیا۔ نہایت اچھی عمارت، بہت کشادہ کمرے جن کی الماریوں میں چُنی ہوئی قطار در قطار کتابیں۔ اور پھر مطالعہ گاہ کا لمبا چوڑا ہال۔ اُس میں خاص طور پر سنجیدہ مطالعے کیلئے آراستہ ایسی میزیں کہ ہر میز پر تین طرف اسکرین تاکہ ہر طالب علم سر جُھکا کر دھیان لگا کر پڑھے کوئی کہیں مخل نہ ہو۔ کسی کا کوئی ہرج نہ ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں خاموشی بھی تھی۔ سکون بھی تھا۔ سب کچھ تھا۔ مگر پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی کرسیاں خالی اور میزیں ویران پڑی تھیں۔

یہ کسی ایک لائبریری کا نہیں، یہ بے شمار کتب خانوں کا سانحہ ہے۔ کتابوں کی حالت اگر خراب ہے تو اُس کی کچھ ذمّے داری ان کے قاری پر بھی آتی ہے جو انہیں تنہا چھوڑ گیا ہے۔

اردو کے نامور استاد، محقق اور انشا پرداز جناب گیان چند جین ان کتب خانوں کی باتیں کر رہے تھے جن میں علوم شرقیہ کی کتابیں چُنی ہیں۔ کہنے لگے۔

"جس کتب خانے میں بھی جائیے، ذاتی کتب خانوں کو چھوڑیئے، اداروں کے کتب خانوں میں بھی مخطوطات گل رہے ہیں۔ دیمک کھا رہے ہیں اور خستہ حالت ہے۔ بڑی دقت یہ ہوگئی ہے کہ موجودہ نسل میں ان کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یہ ہو رہا ہے کہ لوگ ریسرچ کرنے آ رہے ہیں کیونکہ ملازمت کی خاطر ڈگری لینی پڑتی ہے۔ لیکن ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ بیسویں صدی کے کسی زندہ ادیب پر تحقیق کر لی جائے۔ کسی ناول نگار پر یا کسی شاعر پر تھیسس لکھ دیا جائے۔ اس میں بڑی سہولت یہ ہے کہ اس کے پاس جائیں گے۔ اس سے سوانح پوچھ لیں گے۔ وہی تنقید لکھ کر دے دے گا، اور کتاب تیار ہے۔ ایک ایک مصنف پر کئی کئی نے کام کیا ہے۔ لیکن پرانے ادب پر اور انیسویں صدی پر تحقیق کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی اور اس سے پہلے کی دکنی پر کام کرنے کیلئے کوئی آمادہ نہیں ہے۔ تو یہ جو صورت حال ہوگئی ہے۔ اس کا کیا کیا جائے۔ اُردو کے اساتذہ بھی کم ایسے ہیں جنہیں قدیم ادب سے دلچسپی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فارسی جانتے ہوں۔ اب فارسی کا علم ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر مخطوطات سے دلچسپی ہو اور ان کو ترتیب دیں، شائع کریں، اس میں ایک عمر صرف ہوتی ہے جس کا فی الفور کوئی حاصل ہوتا نہیں۔ تو یہ بڑی دشواری ہوگئی ہے۔ اردو کے ساتھ کہ اردو کا جو پرانا ذخیرہ اور خزینہ ہے اس کو کس طرح سامنے لایا جائے۔"

ہندوستان کے برعکس پاکستان میں اُردو، فارسی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی اور کشمیری وغیرہ کی قدیم کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں۔ پاکستان میں زیادہ بڑا مسئلہ ان کتابوں کو بچانے کا ہے۔ مختلف گھرانوں میں نجانے کیسے کیسے نوادر موجود ہیں۔ مگر کوئی دن جاتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں گے اور مستقبل کا مورخ اپنی بے بسی اور ہماری بے حسی پر آنسو بہایا کریگا اس بارے میں جناب مشفق خواجہ نے پتے کی بات کہی۔

"ہمارے ہاں کوئی قانون ایسا نہیں بنا کہ ان نوادر کی حفاظت کی جائے۔ دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں حکومتیں یہ ذاتی ذخیرے دو طرح سے حاصل کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں اُن کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں آپ کی یادگار کے طور پر طویل عرصے تک محفوظ رہیں گی۔ آپ کا نام ان کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ تو لوگ ان دو وجوہ سے اپنے ذخیروں کو الگ کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں مخطوطات کی خریداری کے سلسلے میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جتنا بھی کام ہوا ہے ایک شخص کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اور وہ تھے مرحوم ممتاز حسن۔ وہ مر گئے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے"

مشفق خواجہ تحقیق کے آدمی ہیں اور کتابوں کو جتنے قریب سے وہ دیکھتے ہیں اور کتابوں کی حالتِ زار پر جتنی تشویش انہیں ہو گی، عام لوگوں کو نہیں ہو سکتی۔ ہم نے مشفق خواجہ صاحب سے، جو کراچی میں رہتے ہیں۔ پوچھا کہ آپ ہی بتائیے اس بارے میں کیا ہونا چاہیئے؟

"میری رائے تو یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کو اس سلسلے میں سب سے پہلا کام تو یہ کرنا چاہیئے کہ جہاں جہاں بھی ذخیرے ہیں ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ ایسے لوگوں کو متعین کیا جائے جو ان مخطوطات کو محفوظ کرنے کا کام جانتے ہوں اس کے بعد ان ذخیروں کے کیٹلاگ بننے چاہئیں اور تحقیق کرنے والوں کو سہولتیں دینی چاہئیں اور جو اہم مخطوطے لاہور میں ہیں ان کے فوٹو اسٹیٹ کراچی میں اور جو کراچی میں ہیں انکے فوٹو اسٹیٹ لاہور میں ہونے چاہئیں۔ یہ کام حکومت ہی کر سکتی ہے، کوئی فرد تو کر نہیں سکتا۔"

جہاں جہاں کتابیں ہیں ان کی فہرستیں بننی چاہئیں۔ کچھ یہی بات جامعہ ملیہ دہلی کے استاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی کہی۔ ان کی تجویز ہے کہ یہ کام بہت سنجیدگی سے اور بڑی باقاعدگی سے اور ضابطے کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرستوں کے بارے

میں پروفیسر نارنگ نے کہا۔

"کچھ فہرستیں چھپی ہیں کچھ نہیں چھپیں۔ مثلاً خدا بخش لائبریری اور رضا لائبریری کے کچھ کیٹلاگ موجود ہیں۔ لیکن جہاں جہاں نہیں ہیں وہاں سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ مخطوطات کی فہرستیں، بلکہ وضاحتی فہرستیں چھاپی جائیں اور ایک سروس ایسی ہونی چاہیئے جہاں سے معلوم ہو سکے کہ کون سی کتاب کہاں کہاں دستیاب ہے۔ یہ کام صرف علوم شرقیہ ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسرے علوم اور دوسری زبانوں کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔ اب فرض کیجئے کہ کوئی میر حسن کی مثنوی کے مخطوطے دیکھنا چاہتا ہے یا کلیات شاہ حاتم دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے اس قسم کی ڈاکومینٹیشن سروس کی مدد سے معلوم ہو جائے کہ یہ چیزیں کہاں کہاں ملیں گی۔ یہ ایک بہت بڑی کمی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں پرانی کتابوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کیلئے بڑا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میوزیم اور آرکائیوز عام لوگوں سے اہم کتابیں خرید رہے ہیں خصوصاً تاریخ کے موضوع پر دِلّی کا نیشنل آرکائیوز کچھ عرصے پہلے تک خریداری کر رہا تھا اور نیشنل میوزیم میں یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کتب خانوں کو حکومت سے معقول رقم مل رہی ہے۔ اور گھرانوں میں موجود کتابوں کو بچانے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں مگر یہ کوششیں بھی مسائل سے آزاد نہیں، جیسا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا۔

"اگرچہ ملک میں ایک قانون بنا تھا کہ مخطوطات چونکہ قومی اہمیت کی میراث کا حصّہ ہیں۔ اس لئے ان کو رجسٹر کرایا جائے۔ وصلیاں ہوں۔ مخطوطات ہوں، تاریخی دستاویزات ہوں، دوسری پرانی ہاتھ کی تحریریں ہوں، انہیں رجسٹر کرانا ضروری قرار دیا گیا۔ اور کچھ لوگوں نے کرایا بھی۔ لیکن ایک تو اس قانون کا عرفان عام نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی رجسٹر نہیں کراتا تو اس قانون کا نفاذ کس طرح ہو کیونکہ قانون کا نفاذ کرنے کے لئے دیانت دار عملے کی ضرورت ہوتی ہے اور سب سے بڑی کمی اس

زمانے میں دیانت ہی کی ہے۔ چنانچہ اس کا نفاذ بالکل نہیں ہو رہا ہے اور جو لوگ رجسٹر نہیں کراتے وہ نہیں کراتے اور وہ اس کا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور کبھی کبھی اتنے گھاٹے میں رہتے ہیں کہ وہ چیزیں گم ہوجاتی ہیں۔ چوری ہوجاتی ہیں اور کہاں سے کہاں پہنچتی ہیں۔ بعض اوقات تو چلیئے کسی میوزیم میں پہنچ گئیں یا کسی دوسری لائبریری میں پہنچ گئیں، بیچ میں کسی نے کچھ کما لیا۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ چیز راہ میں ماری جاتی ہے اور کسی ایسے غلط آدمی کے ہاتھ پڑ جاتی ہے جو اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا اور اس طرح قومی میراث کی وہ کڑی ہمیشہ کے لئے گُم ہو جاتی ہے۔"

بس ہماری کُل گفتگو یہیں ختم ہوتی ہے، اور کیسی ستم ظریفی ہے کہ پروفیسر نارنگ کی بات کا جو آخری جملہ ہے وہی ہم سب کی پہلی تشویش ہے۔ دعویٰ تو ہمارا یہ ہے کہ ہمارا یہ دَور شعور کا دَور ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن قومی میراث کی کڑیاں اگر ایسے دَور میں گم ہوئیں تو یقین ہے کہ آنے والے زمانے ہمارے شعور پر اور شعور کے دعوے پر ہنسیں گے۔

یا شاید روئیں گے۔

پہلا باب

کلاچی

ڈیرہ اسماعیل خاں

۲۰؍اکتوبر ۱۹۸۲ء

جناب رضا علی عابدی صاحب : السلامُ علیکم

آپ کا پروگرام کتب خانہ سُنا۔ بہت پسند آیا۔ اب بات یہ ہے کہ میرے پاس چند پُرانے قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ قدیم اور قیمتی کتابیں میرے دادا جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت دہلی سے اپنے ساتھ یہاں ڈیرے کے محفوظ علاقے میں لائے تھے۔ مگر اب مجھے ان کتابوں کی طرف سے پریشانی ہے۔ آپ نے اپنے پروگرام میں نایاب کتب کے تباہ ہو جانے کی بات بار بار کہی۔ یہ بات مجھے بھی بہت ستاتی ہے اور پریشان بھی کرتی ہے۔

ان کتابوں میں پانچ سو سال پُرانی تفسیر جواہر ہے جو جامع الازہر، قاہرہ میں لکھی گئی ہے۔ تقریباً تین سو سال پرانا قرآن پاک کا ایک بہت قیمتی نسخہ ہے اور شیریں فرہاد (فارسی) کا ایک

بہت قدیم نسخہ ہے۔ مزید برآں کچھ اَور پُرانی کتابیں بھی ہیں۔ خدارا مجھے ان کتابوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ بتا دیجئے اور اُن دوائیوں کے نام بھی بتا دیجئے جو ان کو کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اگر ہو سکے تو کچھ دوائیاں ذاتی طور پر لندن سے بھیج دیجئے۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔

یہ سب باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ کتابیں مجھے بے حد عزیز ہیں۔ یاد رکھئے۔ مر جاؤں گا لیکن یہ کتابیں کسی اکیڈمی، لائبریری یا ادارے کو نہیں دوں گا، بلکہ کسی کو دکھاؤں گا بھی نہیں (سوائے آپ کے) اس لئے خدارا جلد کچھ کیجئے۔

والسلام

ع۔ ص

کتابوں کی کتاب

اس کتاب کا موضوع کتابیں ہیں۔

تمام قدیم سرزمینوں کی طرح پورے پاکستان اور ہندوستان میں بھی نادر اور نایاب کتابیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ یہ کتاب اپنے قاری کو اُن ہی جگہوں پر لے جاتی ہے۔

بہت سی پرانی کتابیں مقبروں، خانقاہوں اور مکتبوں کے طاقوں میں رکھی ہیں۔ کچھ کتابیں دفن کر دی گئی ہیں اور کئی ایسی کتابیں جن کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ تھا احترام کے خیال سے دریا میں بہا دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں ان کا احوال درج ہے۔

ایک بڑی مسلم ریاست کے حکمرانوں کے کتب خانے میں پولیس کا دفتر قائم کیا جا رہا ہے۔ ایک حکمران کی اَن گنت کتابیں خاک کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ ایک حاکم کی کتابیں جس کے محل کے نہ معلوم کس کمرے میں بند ہیں۔ ان صفحوں میں ان کی داستانیں رقم ہیں۔

کتابوں کے ایک بیش بہا ذخیرے کی قدر صرف اس لیے نہیں ہوئی کہ اس کا مالک موٹر مکینک تھا۔ ایک بڑا ذخیرہ اس لیے گمنام رہا کہ اُسے لانے کے لیے پہلے اورنگ آباد سے بس کے ذریعے ڈیڑھ سو میل جانا پڑے گا۔ وہاں سے کشتی میں دریا نے گوداوری پار کرنا ہوگا، پھر بس پکڑ کر ساٹھ میل جانا پڑے گا۔ وہاں سے تقریباً تین میل پیدل چلنا ہوگا۔ اور کوئی اس کے لیے تیار نہیں۔

یہ ایسی ہی بے شمار کتابوں کی کتاب ہے۔

